فلسفۂ

عزاداری و قیامِ امام حسینؑ

خطبات

آیت اللہ العظمیٰ سید علی خامنہ ای مد ظلہ العالی

دار الثقافۃ الاسلامیۃ پاکستان

فلسفہ

عزاداری و قیامِ امام حسینؑ

خطبات

آیت اللہ العظمیٰ سید علی خامنہ ای مدظلہ العالی

دار الثقافۃ الاسلامیۃ پاکستان

فلسفہ

عزاداری و قیامِ امام حسینؑ

خطبات

آیت اللہ العظمیٰ سید علی خامنہ ای مدظلہ العالی

محمد علی بک ڈپو
اینڈ آڈیو، ویڈیو، سی ڈی سینٹر
زوہرا گارڈن دوکان نمبر 2 بریٹو روڈ،
کراچی 74800 فون: 021-2242991

یکے از مطبوعات

دار الثقافۃ الاسلامیۃ پاکستان
۲-جے-۵/۴ — ناظم آباد — نمبر ۲ — کراچی

نامِ کتاب ---------- فلسفۂ عزاداری و قیامِ امام حسینؑ
خطبات ---------- آیت اللہ العظمیٰ سید علی خامنہ ای مدظلہ العالی
ترجمہ ---------- سید سعید حیدر زیدی
ناشر ---------- دار الثقافۃ الاسلامیہ پاکستان
طبع اول ---------- ذی قعدہ ۱۴۱۶ھ - اپریل ۱۹۹۶ء
طبع دوم ---------- جمادی الثانی ۱۴۱۷ھ - اکتوبر ۱۹۹۶ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ○

عرضِ ناشر

خداوندِ حکیم نے کائنات کے کسی معمولی سے معمولی ذرّے کو بھی عبث و بے مقصد خلق نہیں کیا۔ قرآنِ کریم نے بارہا اس بات کی تکرار کی ہے نیز آیاتِ قرآنی سے یہ بھی ثابت ہے کہ یہ پوری کائنات انسان کے لئے خلق کی گئی ہے' اس کا ایک ایک ذرّہ انسان کی خدمت میں مشغول ہے۔ چنانچہ واضح ہوا کہ کائنات کی سب سے افضل ترین مخلوق انسان ہے۔

سوال یہ ہے کہ آیا انسان کی خلقت کا بھی کوئی مقصد ہے؟ جی ہاں! انسان کو بھی ایک اعلیٰ و ارفع اور عظیم الشان مقصد کے لئے خلق کیا گیا ہے۔ لیکن اسے اس ہدف کا پابند نہیں کیا گیا بلکہ اسے آزادی دی گئی ہے کہ وہ جو چاہے اپنے لئے ہدف منتخب کرے۔ البتہ اس کے ساتھ ساتھ صحیح اور حقیقی ہدف کی جانب اس کی رہنمائی کردی گئی ہے۔ اسے فلاح و کامرانی کی راہ دکھانے کے لئے انبیاء مبعوث کئے گئے ہیں۔

لہٰذا انسان کی فضیلت' اہمیت اور قدر و قیمت کا دار و مدار اسی ہدف کے انتخاب اور اس سے وابستگی پر ہے۔ اگر اس نے غلط ہدف کا انتخاب کیا اور اسی پر بضد رہا تو اس میں اور جانور میں کوئی فرق نہیں۔ بنابریں واضح ہے کہ انسان

کی قدر و قیمت کا معیار صحیح ہدف کا انتخاب اور اس سے وابستگی ہے:۔

کائنات کی ہر مخلوق میں مقصد و ہدف کی موجودگی اور انسان کی عظمت و بزرگی میں اس کے اختیار کردہ ہدف و مقصد کے بنیادی مقام کے پیشِ نظر یہ بات عیاں ہے کہ کوئی بھی صاحبِ شعور اور عقلِ سلیم کا حامل انسان بغیر مقصد اور بلا کسی ہدف کے کوئی عمل انجام نہ دے گا۔ اس اصول کی روشنی میں یہ تصور محال ہے کہ ائمہ معصومینؑ (جو علمِ لدنی کے مالک ہیں) ان کے اقدامات کی پشت پر کوئی مقصد کار فرما نہ ہو، امام حسینؑ کے قیام و تحریک اور ان کی عزاداری جس کے لئے رسولِ مقبولؐ سمیت تمام معصومینؑ نے اس قدر سفارش کی ہے اس کا کوئی ہدف نہ ہو۔

یقیناً امام حسینؑ کی تحریک و انقلاب ایک عظیم الشان ہدف کے لئے تھا اور عزاداری کی صورت میں منائی جانے والی اس کی یاد بھی ایک ارفع مقصد رکھتی ہے۔ لیکن افسوس کا مقام ہے کہ یا تو بیشتر عزادارانِ حسینؑ اس مقصد سے آگاہ نہیں، اس کی جانب متوجہ نہیں یا پھر کم از کم وہ عزاداری مناتے ہوئے اس ہدف کو پیشِ نظر نہیں رکھتے، اس کے حصول کے لئے کوشاں نہیں ہوتے اور اسے اسلاف کی ایک سنت کے طور پر مناتے ہیں۔

زیرِ نظر کتابچہ ولیٔ امرِ مسلمین حضرت آیت اللہ العظمیٰ سید علی خامنہ ای مدظلہ العالی کی دو تقاریر پر مشتمل ہے جن میں انہوں نے عزاداری اور حسینی تحریک کے مقاصد پر روشنی ڈالی ہے۔ یہ خطبات اپنے معنی و مفہوم اور محتویٰ کے اعتبار سے امام حسینؑ کی تحریک اور عزاداری کے فلسفے کے بارے میں لکھی گئی ضخیم کتب سے کسی طور کم نہیں۔ ان میں سے ایک تقریر میں عزاداری کو سمت

دینے اور اسے اس کے حقیقی مقصد کے حصول کے لئے برپا کرنے کی تاکید کے ساتھ ساتھ اس میں ہر اس چیز سے پرہیز کی نصیحت کی گئی ہے جو اسے بے مقصد بنا دے یا اسے اس کے حقیقی فلسفے اور مقصد سے دور کرنے کا باعث ہو۔ گویا یہ تقریر عزاداری کے ہدف کی تشخیص اور اس کے تحفظ کی تاکید پر مشتمل ہے۔

دوسری تقریر میں امام حسینؑ کے قیام کی ماہیت کے بارے میں گفتگو کی گئی ہے اور اس موضوع پر ایک نئے انداز سے روشنی ڈالی ہے۔ آپ کا کہنا ہے کہ امام حسینؑ کی تحریک کا مقصد نہ ہی محض حصولِ شہادت تھا جیسا کہ بعض لوگوں کا خیال ہے اور نہ ہی امامؑ حکومت کے حصول کے لئے میدان میں آئے تھے۔ کیوں کہ امامؑ نے جس قسم کے حالات میں قیام کیا ان میں امامؑ کے لئے حکومت کا حصول ممکن نظر نہیں آتا تھا بلکہ دراصل آپؑ نے اپنے قیام کے ذریعہ رہتی دنیا تک کے تمام مسلمانوں کو یہ سبق دیا کہ اگر حکمران کا انحراف اس قدر بڑھ جائے کہ دین کے تمام اصول و احکام خطرے سے دوچار ہوں اور دین کی مکمل نابودی کا خطرہ محسوس ہونے لگے تو خواہ کیسے ہی حالات کیوں نہ ہوں مردِ مومن کو اصلاح و تحفظِ دین کے لئے اپنا فریضہ بہرحال ادا کرنا چاہئے۔

امید ہے یہ خطبات حسینی تحریک کے فلسفے اور اس کے مقصد کی تفہیم اور عزاداریٔ سید الشہداء کو انحرافات اور اس کے غیر شایان امور سے محفوظ رکھنے کے سلسلے میں ایک موثر قدم ثابت ہوں گے۔

خدا سے دعا ہے کہ ہمیں حسینی تحریک کے مقاصد کو سمجھنے اور عزاداریٔ حسینؑ کو اس کے صحیح اہداف کے حصول کی راہ میں بپا کرنے کی توفیق کرامت فرمائے۔ □

عزاداری کی ماہیّت

"آیت اللہ العظمیٰ سید علی خامنہ ای نے محرم ۱۴۱۵ھ کی آمد کے موقع پر ۲۹ر ذی الحجہ ۱۴۱۴ھ کے دن علماء و طلابِ دینی کے ایک اجتماع کے سامنے یہ خطاب ارشاد فرمایا۔"

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

محرم سے مربوط مسائل میں دو نوعیت کی باتیں ہیں۔ (ان میں سے) ایک عاشوراء کی تحریک کے بارے میں گفتگو ہے۔ اگرچہ بزرگوں نے امام حسینؑ کے قیام کے فلسفے کے بارے میں بہت کچھ کہا ہے، لکھا ہے اور اس مفہوم پر بہت قیمتی گفتگو بھی فرمائی ہے۔ لیکن واقعاً اس تابناک و درخشاں حقیقت کے بیان کے لئے ایک عمر درکار ہے۔

عاشوراء کے مسئلے اور قیامِ حسینیؑ پر جس قدر بھی زیادہ غور و فکر کریں اس کے باوجود یہ مسئلہ مختلف پہلوؤں میں غور و فکر، سوچ بچار اور گفتگو کی کشش اور گنجائش رکھتا ہے۔ جتنا بھی اس عظیم قیام کے بارے میں سوچیں ممکن ہے (ہر مرتبہ) تازہ حقائق سے دو چار ہوں۔ یہ وہ پہلا مفہوم ہے جس کے بارے میں اگرچہ پورے سال گفتگو کی جاتی ہے اور کی بھی جانی چاہئے لیکن محرم کو ایک خصوصیت حاصل ہے اور ایامِ محرم میں اس مفہوم پر زیادہ سے زیادہ گفتگو کی جانی چاہئے۔ جس طرح کرتے ہیں اور انشاء اللہ آئندہ بھی کریں گے۔

محرم کی مناسبت سے گفتگو کے قابل دوسرا مفہوم جس کے بارے میں کم ہی گفتگو ہوتی ہے اور ہم چاہتے ہیں کہ آج رات اس کے بارے میں کچھ گفتگو کریں وہ حسین ابنِ علیؑ کی عزاداری اور عاشوراء کا ذکر زندہ رکھنے کی برکات

ہیں۔

مسلّمہ طور پر دوسرے مسلمان برادران پر شیعوں کے نمایاں امتیازات میں سے ایک یہ ہے کہ ان کے یہاں واقعۂ عاشوراء موجود ہے۔

اسی روز سے جب کہ حسین ابنِ علیؑ کی مصیبت کے ذکر کا آغاز ہوا، اہلِ بیتؑ پر اعتقاد رکھنے والوں اور ان کے محبّوں کے قلب و ذہن میں فیض و معنویات کا ایک چشمہ جاری ہوا جو آج تک اسی طرح مسلسل رواں دواں ہے اور انشاء اللہ آئندہ بھی جاری و ساری رہے گا۔ اس کا سبب بھی واقعۂ کربلا کی یاد مناتے رہنا ہے۔

عاشوراء کی یاد محض ایک واقعہ کا تذکرہ نہیں بلکہ ایک ایسے حادثے کا بیان ہے جس کے بے شمار پہلو ہیں۔ اس واقعے کی یاد درحقیقت خود ایک ایسا مفہوم ہے جو بکثرت برکات پر منتج ہو سکتا ہے۔ لہٰذا آپ ملاحظہ فرماتے ہیں کہ ائمہؑ کے زمانے میں امام حسینؑ پر رونے اور رلانے کا مسئلہ ایک خاص مقام رکھتا تھا۔

مبادا کسی کے ذہن میں خیال آئے کہ فکر و منطق اور استدلال کی موجودگی میں رونے اور قدیم ابحاث کی کیا گنجائش ہے؟

نہیں جناب! یہ غلط فہمی ہے ان میں سے ہر چیز کا اپنا ایک مقام ہے۔ ان میں سے ہر ایک کا انسانی شخصیت کی تعمیر میں ایک حصہ ہے۔ جذبات و احساسات کا اپنا مقام ہے اور منطق و استدلال کی بھی اپنی جگہ ہے۔ بہت سی مشکلات کو جذبات و احساسات نے حل کیا ہے اور منطق و استدلال کافی نہیں۔ آپ اگر جائزہ لیں تو دیکھیں گے کہ انبیاءؑ کی تحریکوں میں، اس وقت جب کہ انبیاءؑ مبعوث ہوتے تھے تو پہلے مرحلے پر ان کے گرد جمع ہونے والے لوگوں کے اکٹھا ہونے کا

اصل محرک منطق و استدلال نہ تھا۔

آپ کو پیغمبرِ اسلامؐ کی تاریخ میں، جو ایک مدون اور واضح تاریخ ہے نہیں ملے گا کہ مثلاً آنحضرتؐ نے کفارِ قریش کے ایک بااہلیت اور صاحبِ استعداد گروہ کو بٹھایا ہو اور ان پر استدلال کیا ہو اور مثلاً کہا ہو کہ اس دلیل سے خدا کا وجود ثابت ہے یا اس دلیل سے خدا واحد ہے۔ یا اس عقلی دلیل سے بت باطل ہیں۔ پیغمبرِ اسلامؐ کے استدلال بعد کے دور سے مربوط ہیں۔ عقلی دلائل اس زمانے سے مربوط ہیں جب آپؐ کی تحریک آگے بڑھی، ابتداء میں آپؐ کی تحریک جذبات و احساسات پر مبنی تھی۔

پہلے مرحلے میں پیغمبرؐ نے ناگہاں آواز بلند کی کہ ان بتوں کی جانب نظر اٹھاؤ، دیکھو کہ یہ ناتواں ہیں۔ اسی مرحلے میں آپؐ نے ارشاد فرمایا کہ دیکھو خدا واحد ہے۔ "قولوا لا الہ الا اللہ تفلحوا" کس دلیل سے "لا الہ الا اللہ" موجبِ فلاح ہے؟ یہاں کون سا عقلی اور فلسفی استدلال پایا جاتا ہے۔ البتہ ہر سچے احساس کی پشت پر ایک فلسفی دلیل موجود ہوتی ہے۔ لیکن ہماری بحث اس بات میں ہے کہ جب نبی اپنی دعوت شروع کرنا چاہتا ہے تو فلسفی استدلال پیش نہیں کرتا، سچے احساس و جذبات کو سامنے لاتا ہے۔

البتہ وہ سچا احساس غیر منطقی اور غلط نہیں ہوتا، اپنے اندر خود ایک استدلال بھی رکھتا ہے۔ ابتداء میں یہ احساس معاشرہ میں جاری ظلم و ستم، طبقاتی اختلافات نیز اس دباؤ کی جانب متوجہ کرتا ہے جو جنسِ بشر و شیاطینِ انس میں سے خدا بن بیٹھنے والے لوگ لوگوں پر روا رکھتے ہیں۔ پھر جب تحریک معقول اور معمول کی روش پر چل پڑتی ہے تو منطقی استدلال کی باری آتی ہے۔ ایسے لوگ جو

عقلی طور پر پختہ اور فکری نمو کے حامل ہوتے ہیں عام استدلال سے واقف ہوجاتے ہیں، بعض انہی ابتدائی درجات میں رہ جاتے ہیں۔ البتہ یہ نہیں کہہ سکتے کہ وہ لوگ جو استدلال کے اعتبار سے بلند درجے پر ہوتے ہیں وہ معنوی درجات کے لحاظ سے بھی لازماً بالاتر درجات پر ہوں۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ وہ لوگ جن کی عقلی سطح نیچے ہوتی ہے مبداء غیبی اور پیغمبرؐ کے ساتھ ان کا جوشِ جذبات اور ارتباط و علاقہ زیادہ اور ان کی محبت زیادہ پرجوش ہوتی ہے اور یہی لوگ بالاترین درجات حاصل کرلیتے ہیں۔

اصل بات یہ ہے کہ جذبات کا اپنا مقام اور اہمیت ہے، نہ ہی جذبات استدلال کی جگہ لے سکتے ہیں اور نہ استدلال جذبات کی جگہ۔

عاشوراء کا حادثہ اپنی ذات و طبیعت میں خود ٹھاٹھیں مارتے ہوئے سچے جذبات کا ایک سمندر ہے۔ بلند مرتبہ، پاکیزہ، منور اور بے عیب ملکوتی شخصیت رکھنے والا ایک انسان، ایک ایسے ہدف کے لئے قیام کرتا ہے کہ ظلم و جور اور جنگ و عدوان سے معاشرے کی نجات کے لئے جس کی صحت پر تمام منصفینِ عالم متفق ہیں۔

"ایها الناس ! أن رسول اللّٰہ قال : من رای سلطانا جائرا"

"اے لوگو! رسول اللہؐ نے فرمایا : جو کوئی کسی ظالم بادشاہ کو دیکھے۔"

گفتگو اس بارے میں ہے، امام حسینؑ اپنی تحریک کا فلسفہ و مقصد ظلم سے مقابلہ قرار دیتے ہیں۔

"یعمل فی عباداللہ بالجور و الطغیان "یا" بالاثم

والعدوان"

"لوگوں سے ظلم و ستم کا برتاؤ کرتا ہے۔"

بحث اس موضوع پر ہے۔

ایک ایسا انسان، مقدس ترین مقصد کی راہ میں، جس کو تمام منصفینِ عالم قبول کرتے ہیں دشوار ترین جنگ کو برداشت کرتا ہے۔ دشوار ترین جنگ، عالمِ تنہائی میں لڑی جانے والی جنگ ہے۔ دوستوں کے نعروں اور عام لوگوں کی تحسین و آفرین کی صداؤں کے درمیان موت کا سامنا کرنا چنداں مشکل نہیں۔ جب حق و باطل کی صف آرائی ہو اور پیغمبرؐ اور امیرالمومنینؑ (علیؑ) کی مانند کوئی حق کے محاذ کے راس و رئیس کے طور پر کھڑا ہو اور کہے کہ "کون ہے جو میدان میں جائے؟ تو سب ہی لپکتے ہیں۔ پیغمبرؐ میدان میں جانے والوں کے لئے دعا کرتے ہیں۔ ان کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہیں، چند قدم ان کے ساتھ چلتے ہیں، مسلمان ان کے لئے دعا مانگتے ہیں۔ اس کے بعد وہ میدان کی طرف جاتے ہیں، جہاد کرتے ہیں اور شہادت پاتے ہیں۔

یہ قتل ہونے اور جہاد کرنے کی ایک قسم ہے۔ جہاد کی ایک اور قسم وہ جہاد ہے کہ جب انسان میدانِ نبرد کی جانب قدم بڑھاتا ہے تو پورا کا پورا معاشرہ یا تو اس سے منکر ہے یا غافل، یا تو اس سے لاتعلق ہے یا اس کا مخالف، دل سے اسے قابلِ تحسین سمجھنے والے کم لوگ ہوں اور وہ بھی اس کی زبانی تحسین کی جرات نہ رکھتے ہوں۔ یعنی عاشوراء کے حادثے میں عبداللہ ابنِ عباس اور عبداللہ ابنِ جعفر جیسے لوگ کہ جو خود خاندانِ بنی ہاشم کا حصہ تھے، اس شجرۂ طیبہ کا جز تھے جرات نہیں کرتے کہ آئیں اور آکے مکہ یا مدینہ میں صدا بلند کریں اور

امام حسینؑ کے نام کا نعرہ لگائیں۔

یہ ہے غریبانہ جنگ، جنگوں میں دشوار ترین یہ جنگ ہے۔ سب اس انسان کے دشمن ہیں، سب اس سے روگرداں ہیں۔ حتیٰ اس کے دوست بھی اس سے چشم پوشی کئے ہوئے ہیں۔ یہاں تک کہ جب امام حسینؑ ایک شخص سے مدد کی درخواست کرتے ہیں تو وہ خود مدد کرنے کے بجائے اپنے گھوڑے کی پیش کش کرتا ہے۔ کہ آیئے میرے اس گھوڑے سے استفادہ کیجئے۔

آیا اس سے زیادہ کوئی غربت ہو سکتی ہے اور اس سے زیادہ کوئی غریبانہ جنگ ہو سکتی ہے؟

اس جنگ کے دوران ان کی نگاہوں کے سامنے ان کے عزیز ترین فرزند قربان ہوئے ہیں، ان کے بچے، بھتیجے، بھائی، چچازاد بھائی اور بنی ہاشم کے پھول ان کے سامنے زمین پر بکھر رہے ہیں۔ حد تو یہ ہے کہ ان کا چھ مہینے کا بچہ بھی ذبح ہو جاتا ہے۔ ان سب کے علاوہ وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ جوں ہی ان کی روح جسمِ مطہر سے جدا ہوگی ان کے بے آسرا ہو جانے والے اہل و عیال پر یورش ہوگی۔ یہ بھوکے بھیڑیے جوان بیٹیوں کو گھیر لیں گے، ان کو خوفزدہ کریں گے، ان کے اموال کو غارت کریں گے، انہیں اسیر بنائیں گے، ان کی اہانت کریں گے۔ امیرالمومنینؑ کی عظیم بیٹی زینبِ کبریٰؑ جو دنیائے اسلام کی ممتاز خواتین میں سے ہیں، ان کے سامنے جسارت کریں گے۔ اباعبداللہ الحسینؑ یہ سب کچھ جانتے تھے۔۔۔ ملاحظہ کیا۔ یہ جنگ، یہ مقابلہ کس قدر سخت ہے۔

اس قدر عظیم المرتبت انسان، پاک، مطہر اور منور ہستی۔ وہ انسان جس کے دیدار کے لئے آسمانی فرشتے ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کرتے

ہیں تاکہ حسین ابنِ علیؑ کا دیدار کریں اور متبرک ہو جائیں' انبیاء و اولیاء جن کے مقام کے حصول کی آرزو کرتے ہیں وہ ایسے شدید اور ابتلاء و آزمائشوں سے پُر مقابلے کے بعد جامِ شہادت نوش کرتا ہے۔

کون ایسا انسان ہے جس کے جذبات و احساسات اس حادثے پر مجروح نہ ہوں۔ اور کون انسان ہے جو اس حادثے کے بارے میں جانتا ہو' اسے سمجھتا ہو اور پھر اس سے دلبستہ نہ ہو؟ یہ وہ پُرجوش چشمہ ہے جو روزِ عاشور جاری ہوا' اسی وقت جب ایک نقل کے مطابق زینبِ کبریٰؑ "تلِ زینبیہ" پر تشریف لے گئیں اور پیغمبرِ اسلامؐ کو خطاب کرکے فرمایا۔

"یا رسول اللہ صلی علیک ملائکہ السماء ھذا حسینک مرمل بالدماء مقطع الاعضاء مسلوب العمامہ والرداء"

"یا رسول اللہؐ آپؐ پر آسمان کے فرشتے درود بھیجتے ہیں' اور یہ آپؐ کا حسینؑ ہے جو خون میں ڈوبا ہوا ہے' جس کا بدن ٹکڑے ٹکڑے ہے اور جس کا عمامہ اور ردا چھن چکی ہے۔"

زینبؑ نے با آوازِ بلند امام حسینؑ کا نوحہ پڑھنا اور ماجرے کو بیان کرنا شروع کیا۔ وہ ماجرا جسے (ان کے دشمن) چھپانا چاہتے تھے۔ وہ انہوں نے با آواز بلند نشر کردیا۔ کربلا میں بیان کیا' کوفہ میں بیان کیا' شام میں بیان کیا' مدینہ میں بیان کیا اور یوں اس چشمے نے جوش مارنا شروع کردیا۔ یہاں تک کہ آج بھی جوش مار رہا ہے' یہ واقعِ عاشوراء ہے۔

ایک وقت ممکن ہے کسی کے پاس کوئی نعمت نہ ہو' لہٰذا اس سے اس نعمت

کے بارے میں سوال نہیں کیا جائے گا۔ لیکن اگر کسی کو نعمت میسّر ہو تو پھر اس سے سوال ہوگا۔ ایک عظیم ترین نعمت حسین ابنِ علیؑ کی یاد ہے۔ یہی مجالسِ عزاء کی نعمت ہے۔ محرم اور عاشوراء کی نعمت ہم شیعوں کو میسّر ہے۔ افسوس کہ ہمارے غیر شیعہ مسلمان بھائیوں کو یہ نعمت میسّر نہیں۔ وہ اس نعمتِ عظیم کو حاصل کرسکتے ہیں۔ البتہ کہیں کہیں ان میں سے بعض لوگ امام حسینؑ کی عزاداری مناتے ہیں۔ لیکن (عام طور پر) عزاداری ان کے یہاں رائج نہیں۔ لیکن ہمارے (شیعوں کے) درمیان رائج ہے۔

ان مجلسوں اور اس یاد سے کیا فائدہ اٹھانا چاہئے؟ اس نعمت کے شکر کا طریقہ کیا ہے؟ یہ وہ بات ہے جسے میں آپ کے سامنے سوال کی صورت میں پیش کرنا چاہتا ہوں اور آپ اس کا جواب دیجئے۔

یہ نعمت اپنی تمام تر عظمت کے ساتھ دلوں کو اسلامی ایمان کے پُرجوش سرچشمے سے متصل کردیتی ہے۔ اس نعمت نے وہ کام کیا ہے کہ تاریخ میں ظالم حکمران عاشوراء اور امام حسینؑ کی مرقدِ اطہر سے خوفزدہ رہے ہیں۔ یہ خوف بنی امیّہ کے خلفاء کے دور سے شروع ہوا اور آج تک جاری ہے۔ اور آپ نے اس کا ایک نمونہ خود ہمارے انقلاب میں دیکھا ہے۔ جب محرم آیا تو فاسق' فاسد اور کافر و رجعت پسند پہلوی نظام کے کارپرداز خود کو بے دست و پا اور عاجز و ناتواں پاتے تھے۔ انہیں معلوم تھا کہ محرم آگیا ہے۔ اس منحوس حکومت کی بچی کھچی رپورٹوں میں صراحتاً ایسی باتیں موجود ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ محرم کی آمد پر ہواس باختہ ہوجاتے تھے۔ اور ہمارے امامِ بزرگوار (رضوان اللہ علیہ) وہ حکیم' دور اندیش' دنیا شناس اور انسان شناس ہستی خوب جانتی تھی کہ

امام حسینؑ کے مقاصد کو آگے بڑھانے کے لئے اس حادثے سے کس طرح استفادہ کیا جائے۔ آپ نے محرم کو شمشیر پر خون کی فتح کا مہینہ قرار دیا۔ اور اسی تجزیہ، منطق اور محرم کی برکت سے خون کو شمشیر پر فاتح کیا۔ یہ ایک ایسا نمونہ ہے جسے آپ نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا۔

اس نعمت سے استفادہ کرنا چاہئے، لوگوں کو بھی اور علماء کو بھی۔ عوام الناس اس سے اس طرح استفادہ کرسکتے ہیں کہ عزاداری کی مجالس میں دل سے شرکت کریں اور یہ مجالس بپا کریں۔ لوگوں کو چاہئے کہ ہر سطح پر مجالسِ عزاء میں اضافہ کریں۔ ان مجالس میں خلوص کے ساتھ شریک ہوں اور ان سے استفادے کے لئے شرکت کریں صرف وقت گزاری کے لئے نہیں۔ یا عامیانہ صورت میں محض ثوابِ اُخروی کے لئے نہیں کہ یہ بھی نہیں جانتے کہ یہ اُخروی ثواب کیوں کر حاصل ہوتا ہے۔

مسلّما طور پر ان مجالس میں حاضری اُخروی ثواب کی حامل ہے۔ لیکن یہ اُخروی ثواب کس بنا پر ہے؟ کس وجہ سے ہے؟ اس ثواب کی یقیناً ایک وجہ ہے اور اگر یہ وجہ مفقود ہو تو ثواب بھی نہ ہوگا۔ بعض لوگ اس وجہ اور سبب کی جانب متوجہ نہیں ہوتے۔

لوگوں کو ان مجالس میں شرکت کرنی چاہئے۔ ان کی قدر و قیمت کو جاننا چاہئے اور ان سے استفادہ کرنا چاہئے۔ لوگوں کو چاہئے کہ وہ ان مجالس کو حسین ابنِ علیؑ، خاندانِ پیغمبرؐ اور قرآن و اسلام کی روح سے ہر ممکن حد تک مضبوط روحانی اور قلبی اتصال و ارتباط کا وسیلہ بنائیں۔

لیکن جو بات علماء سے مربوط ہے وہ دشوار تر ہے۔ کیونکہ مجالسِ عزا کی

ماہیت یہ ہے کہ کچھ لوگ جمع ہوں اور ایک عالم اس مجلس میں شریک ہو اور مجلسِ عزاء برپا کرے تاکہ دوسرے لوگ اس سے استفادہ کریں۔

آپ لوگ کس طرح مجلسِ عزاء برپا کرتے ہیں؟

میرا یہ سوال ان تمام لوگوں سے ہے جو اس مسئلہ کے بارے میں احساسِ ذمہ داری رکھتے ہیں۔

میری نظر میں مجلس میں تین چیزوں کو ہونا چاہئے۔

پہلی چیز یہ کہ یہ مجالس محبتِ اہلِ بیتؑ میں اضافہ کریں، کیونکہ جذباتی تعلق ایک ذی قیمت تعلق ہے۔ لہٰذا آپ کو وہ کام کرنا چاہئے جس کے ذریعہ ان مجالس میں شرکت کرنے والوں کی حسین ابنِ علیؑ، خاندانِ رسولؐ اور معرفتِ الٰہی کے چشموں سے محبت و تعلق میں روز بروز اضافہ ہو۔

اگر خدانخواستہ آپ ان مجالس میں ایسے حالات پیدا کردیں کہ اس مجلس کے سامع یا اس مجلس سے باہر شخص جذبات و احساسات کے لحاظ سے اہلِ بیتؑ سے نزدیک نہ ہو اور خدانخواستہ دور ہوجائے اور دوری و بیزاری کا احساس کرے تو ایسی صورتِ حال میں مجلسِ عزاء نہ صرف اپنا ایک بڑا فائدہ کھو بیٹھے گی بلکہ ایک لحاظ سے مضر بھی ہوگی۔

اب اس حیثیت سے کہ آپ مجلس کے بانی اور خطیب ہیں جائزہ لیجئے کہ کیا کام کیا جائے کہ ان مجالس میں شرکت سے حسین ابنِ علیؑ اور اہلِ بیتِ پیغمبرؐ کے بارے میں لوگوں کے جذبات میں روز بروز اضافہ ہو۔

دوسرا نکتہ یہ ہے کہ ان مجالس میں لوگوں کے لئے واقعۂ عاشوراء کے بارے میں ایک واضح اور روشن تر معرفت وجود میں آئے۔ ایسا نہ ہو کہ ہم مجلسِ حسین

ابنِ علیؑ میں آئیں، ایک تقریر کریں، منبر پر جائیں یہاں تک کہ اگر اس مجلس میں غور و فکر کرنے والا کوئی شخص موجود ہو (آج انقلابِ اسلامی کی برکات سے ہمارے معاشرے میں بکثرت ایسے افراد موجود ہیں) اور وہ سوچے کہ میں کیوں یہاں آیا ہوں، مسئلہ کیا تھا؟ امام حسینؑ پر گریہ وزاری کرنا کیوں ضروری ہے؟ امام حسینؑ آخر کربلا کیوں آئے اور عاشوراء کا واقعہ کیوں پیش آیا؟

(ہماری مجلس کو) ایسا ہونا چاہئے کہ اگر کسی کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہوں تو آپ اس کے سوال کا جواب دیتے ہوں۔ پس آپ جو تقریر کرتے ہیں، جو اشعار پڑھتے ہیں اور جو مفاہیم بیان کرتے ہیں اگر ان میں ان معنوں کی جانب کوئی نکتہ نہ ہو حتیٰ ان کی جانب اشارہ تک نہ ہو تو ہم نے جن تین ارکان کا تذکرہ کیا ان میں سے ایک رکن کم یا ناقص ہے اور ممکن ہے اس مجلس سے ضروری فائدہ حاصل نہ ہو اور ممکن ہے خدا نخواستہ بعض مقامات پر نقصان بھی پہنچ جائے۔

تیسری چیز جو ان مجالس میں ضروری ہے وہ یہ ہے کہ یہ لوگوں کی دینی معرفت اور مذہبی ایمان میں اضافے کا موجب ہوں۔ آپ کو چاہئے کہ دین میں سے کوئی ایک ایسی چیز اس مجلس میں بیان کیجئے جو ایمان و معرفت میں اضافے کا سبب ہو۔ ایک صحیح نصیحت، ایک صحیح حدیث، تاریخ کا کوئی سبق آموز موضوع، ایک آیہ قرآن کی تفسیر اور کسی عالم اور عظیم اسلامی مفکر کا کوئی نکتہ ان چیزوں میں سے ہیں جنہیں بیان کیا جاسکتا ہے۔ ایسا نہ ہو کہ ہم منبر پر جائیں، کچھ لفاظی کریں اور اگر کوئی بات بیان کریں بھی تو ایسی بے سروپا جو نہ صرف یہ کہ سننے والوں کے ایمان میں اضافہ نہ کرے بلکہ لوگوں کا ایمان کمزور کردے۔

میں آپ کی خدمت میں عرض کرنا چاہتا ہوں کہ بدقسمتی سے کبھی کبھی ایسے مواقع دیکھنے میں آتے ہیں۔

کبھی دیکھنے میں آتا ہے کہ کسی مجلس کا خطیب ایسا مفہوم نقل کرتا ہے جو استدلال کے لحاظ سے بھی اور عقلی و نقلی مدرک کے اعتبار سے بھی بے سروپا ہوتا ہے اور ایک بابصیرت اور منطق و استدلال رکھنے والے سامع کے ذہن پر بھی مضر اثرات مرتب کرتا ہے۔ بعض لوگوں نے کتابوں میں کچھ ایسی باتیں لکھی ہیں جن کے جھوٹا ہونے کی کوئی دلیل ہمارے پاس موجود نہیں۔ ممکن ہے صحیح ہوں اور ممکن ہے غلط۔ ان کے جھوٹا ہونے پر کوئی دلیل نہیں۔ لیکن جب آپ اس کو بیان کریں اور آپ کا سامع جو ممکن ہے ایک جوان ہو، ایک طالب علم ہو، ایک جانباز ہو، یا ایک انقلابی ہو (کہ بحمد اللہ انقلاب نے ذہنوں کو کھول دیا ہے) اس چیز کو آپ سے سنے اور ممکن ہے اس کی وجہ سے دین کے بارے میں اس کے دل میں کوئی شک و شبہ ایجاد ہو اور اس کے ذہن میں ایک گرہ پڑ جائے۔ لہٰذا کوئی ایسی بات نہیں کہنی چاہئے۔ حتیٰ اگر اس مفہوم کی سند بھی درست ہو۔ لیکن کیونکہ یہ بات انحراف و گمراہی کا موجب ہے اس لئے اسے نہیں کہنا چاہئے۔ چہ جائیکہ ان میں سے اکثر چیزیں درست سند بھی نہیں رکھتیں۔

ایک شخص کسی سے کوئی بات سنتا ہے۔ ایک نے نقل کیا ہے کہ میں فلاں جگہ پر تھا اور فلاں سفر میں، فلاں واقعہ رونما ہوا خطیب نے کسی سند کے ساتھ یا بغیر کسی سند کے یہ بات بیان کی اور سامع نے بھی اس پر یقین کرلیا اور پھر اتفاق سے اس نے اسے کسی کتاب میں بھی نقل کردیا۔

ہم کیوں ایسی بات کہیں جو ایک بڑے مجمع اور ذی فہم اور باشعور شخص کے

لئے قابلِ قبول نہ ہو؟ کیا انسان پر ہر وہ چیز بیان کردینا لازم ہے جو کہیں تحریر ہو؟

آج یہ ہمارے معاشرے کا ایک تمدنی بحران ہے۔

ہم انقلاب سے پہلے کہتے تھے کہ پڑھے لکھے جوان، لیکن آج پڑھے لکھے لوگ محض جوانوں تک محدود نہیں بلکہ جوانوں کے علاوہ بھی زن و مرد، لڑکے لڑکیوں کے اذہان روشن ہوچکے ہیں۔ وہ مسائل کو نگاہِ بصیرت سے دیکھتے ہیں، سمجھنا چاہتے ہیں۔ ان لوگوں کو شبہات کا سامنا ہوتا ہے، یہ ہمارے زمانے کا تمدنی بحران ہے۔ نہ صرف ہمارے دشمن بلکہ ہماری اور آپ کی فکر کے منکرین بھی شبہات ڈالتے ہیں۔ کیا یہ کہا جاسکتا ہے کہ جو کوئی ہماری فکر کو قبول نہیں کرتا گونگا ہوجائے، زبان نہ کھولے اور کوئی شبہ پیدا نہ کرے؟ (جب کہ دوسرے شبہات پیدا کرتے ہیں، باتیں بناتے ہیں، مفاہیم پھیلاتے ہیں، شک و تردید ایجاد کرتے ہیں، لٰہذا آپ ایسی چیز بولئے جو شبہات کو دور کرے ایسی بات نہ کیجئے جو شبہات میں اضافہ کرے۔

بعض لوگ اس اہم ذمہ داری پر توجہ کئے بغیر بالائے منبر ایسی گفتگو کرتے ہیں جو نہ صرف یہ کہ سامع کے ذہن میں موجود کسی گرہ کو نہیں کھولتی بلکہ اس کے ذہن میں مزید گرہیں ڈال دیتی ہے۔ فرض کیجئے اگر ہم بالائے منبر ایک بات کہیں جس سے دس، پانچ یا صرف ایک ہی جوان دین کے کسی مسئلے میں شک و شبہ کا شکار ہوجائے، وہ چلا جائے اور ہم اسے پہچانتے نہ ہوں، تو کس طرح اس کا ازالہ کریں گے؟ کیا کسی صورت اس کی تلافی ممکن ہے؟ کیا خدا ہمیں معاف کردے گا؟ مشکل مسئلہ ہے۔

پس خطاب کو تین محوروں پر مشتمل ہونا چاہئے۔ پہلا یہ کہ حسین ابنِ علیؑ

اور اہلِ بیتِ پیغمبرؐ سے جذباتی لگاؤ میں اضافہ کرے اور احساس و جذبات کے بندھن کو مضبوط کرے۔ دوسرے یہ کہ عاشوراء کے بارے میں سامع کو ایک واضح اور روشن نظریہ دے اور تیسرے یہ کہ معارفِ دینی کے بارے میں معرفت بھی پیدا کرے اور ایمان بھی ایجاد کرے۔

ہم یہ نہیں کہتے کہ ہر خطاب میں لازماً یہ تمام چیزیں موجود ہوں۔ آپ اگر ایک معتبر کتاب سے ایک صحیح حدیث نقل کرکے اس کے معنی بیان کریں تو بہت موثر ہوسکتا ہے۔ بعض لوگ بسااوقات ایک حدیث میں اس قدر گل کاریاں کرتے ہیں کہ اس کے اصل معنی ہی ختم ہوجاتے ہیں۔ اگر آپ اسی ایک حدیث کے صحیح معنی کریں تو ممکن ہے جو ہم چاہتے ہیں اس کا ایک بڑا حصہ اس میں موجود ہو، اگر آپ ایک معتبر تفسیر سے ایک آیہء قرآن کو غور و فکر، مطالعہ اور تجزیہ کے بعد بیان کریں تو مقصود حاصل ہوجائے۔ مصائب کے ذکر کے لئے مرحوم محدث قمیؒ کی نفس المہموم کھول کر پڑھ دیجئے۔ آپ دیکھیں گے اس سے سامع پر گریہ بندھ جائے گا۔ جذبات میں ہیجان بپا کردے گی۔

ضروری ہے کہ ہم اپنے خیال میں مجلس آرائی کے لئے ایسے کام کریں جن سے مجلسِ عزاء اپنے اصل فلسفے ہی سے جدا ہوجائے؟ میں حقیقتاً اس بات سے وحشت زدہ ہوں کہ کہیں ہم خدانخواستہ اس زمانے میں جو اسلام کے ظہور و نمو اور اسلام اور فکرِ اہلِ بیتؑ کی تجلی کا دور ہے اپنے فریضے کو انجام نہ دے سکیں۔

ایک چیز ہے جو لوگوں کو خدا اور دین سے نزدیک کرتی ہے۔ یہ سنتِ عزاداری ہے جو لوگوں کو دین کے قریب لاتی ہے۔ امامؒ (خمینی) نے فرمایا ہے کہ "سنتِ عزاداری بپا کیجئے۔" مجالس میں بیٹھنا، مصائب پڑھنا، گریہ کرنا، سرو سینہ پیٹنا،

عزاداری کے جلوس، ماتمی انجمنیں، یہ تمام وہ چیزیں ہیں جو اہلِ بیتؑ کے لئے جذبات کو ابھارتی ہیں، جو ایک بہت اچھی چیز ہے۔

اس کے برخلاف ایک اور چیز ہے جو لوگوں کو دین سے برگشتہ کردیتی ہے۔ انتہائی افسوس کے ساتھ کہتا ہوں کہ گزشتہ تین چار برسوں میں ایسے کاموں کا آغاز ہوا ہے جنہیں میرے خیال میں بعض (پوشیدہ) ہاتھ ہمارے معاشرے میں ترویج دے رہے ہیں۔ جنہیں جو کوئی دیکھتا ہے اس کے ذہن میں سوال ابھرتا ہے۔

قدیم زمانہ میں عوام الناس کے طبقے کا معمول تھا کہ عزاداری کے ایام میں اپنے جسم کو قفل لگاتے تھے۔ بزرگ علماء نے اس کی مخالفت کی اور یہ رسم ختم ہوگئی۔ اب پھر اسے دوبارہ شروع کیا گیا ہے اور میں نے سنا ہے کہ مختلف مقامات پر بعض لوگ قفل لگاتے ہیں۔ یہ کیا کام ہے جسے بعض لوگ انجام دیتے ہیں؟ قمہ زنی بھی اسی طرح ہے۔ قمہ زنی بھی غلط کاموں میں سے ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ اب بعض لوگ کہیں گے کہ حقیقت یہ ہے کہ فلاں صاحب کو قمہ کا نام نہیں لینا چاہئے تھا۔ آپ کو کیا، چھوڑیئے، انہیں لگانے دیجئے۔

نہیں جناب! ایسا نہیں ہوسکتا۔ جس طرح گزشتہ چار پانچ برسوں اور جنگ (ایران عراق جنگ کی جانب اشارہ ہے) کے بعد قمہ زنی کی ترویج کی جارہی ہے۔ اگر ایسا امامؒ (خمینی) کی حیاتِ مبارک میں ہوتا تو قطعی طور پر وہ اس کی مخالفت میں کھڑے ہوجاتے (حاضرین کا نعرہ تکبیر)۔ یہ ایک غلط عمل ہے کہ بعض لوگ قمہ ہاتھ میں لے کر اپنے سر پر ماریں اور خون بہائیں۔ یہ کیا عمل ہے؟ کس طرح اس کام کو عزاداری میں سے کہا جاسکتا ہے؟ قمہ سر پر مارنا عزاداری ہے؟

اگر آپ دیکھیں تو جن لوگوں کو مصیبت پیش آتی ہے وہ اپنا سر و سینہ پیٹتے ہیں۔ یہ ہے عزاداری۔ آپ نے کہاں دیکھا ہے کہ ایک شخص اپنے محبوب ترین عزیز کے غم میں تلوار اپنے سر پر مارتا ہو اور اپنے سر سے خون بہاتا ہو۔ کس اعتبار سے یہ کام عزاداری ہے؟ یہ جعلی کام ہے۔ یہ وہ چیزیں ہیں جو دین کا حصہ نہیں ہیں۔ بے شک خدا ان کاموں سے راضی نہیں ہے۔

علماء سلف کے ہاتھ بندھے ہوئے تھے اور وہ یہ باتیں نہیں کہہ سکتے تھے۔ لیکن آج اسلام کی حاکمیت اور اسلام کی تجلی کا زمانہ ہے۔ ہمیں ایسے کام نہیں کرنے چاہئیں کہ اعلیٰ اسلامی اقدار کا حامل ہمارا معاشرہ، یعنی محبانِ اہلِ بیتؑ کا معاشرہ، وہ معاشرہ جس کے لئے ولیٔ عصر (ارواحنا فداہ)، حسین ابنِ علیؑ اور امیرالمومنینؑ کے اسمائے مبارک باعثِ افتخار ہیں مسلمانانِ عالم اور غیر مسلموں کی نظر میں ایک خرافات پرست اور بے منطق گروہ کے طور پر پہچانا جائے۔

میں نے جس قدر سوچا، غور و فکر کیا، اس نتیجے پر پہنچا کہ کسی طور ممکن نہیں کہ اس قطعی غلط بات اور بدعت سے اپنے عزیز عوام کو آگاہ نہ کروں۔ یہ عمل انجام نہ دیجئے میں قطعاً اس سے راضی نہیں۔ اگر کوئی قمہ زنی کا مظاہرہ کرے تو میں دلی طور پر اس سے ناراض ہوں۔ یہ جو میں نے (مظاہرے والی بات) عرض کیا اس لئے ہے کہ کسی زمانے میں کسی مقام پر چند لوگ جمع ہوتے تھے اور یہ کام کرتے تھے، ایسا ایک گوشے میں ہوتا تھا، کوئی انہیں نہیں دیکھتا تھا، اس طرح مظاہرہ نہیں ہوتا تھا۔ لہٰذا کسی کو ان سے کوئی غرض بھی نہ تھی، اب یہ بات خواہ اچھی تھی یا بری لیکن ایک محدود دائرے میں انجام پاتی تھی۔ لیکن جب یہ طے کیا جائے کہ چند ہزار لوگ اچانک تہران، قم، آذربائیجان کے کسی شہر یا خراسان

کی کسی شاہراہ پر قمہ ہاتھوں میں لئے ظاہر ہوں گے اور انہیں اپنے سر پر ماریں گے تو یہ بات قطعاً غلط ہے۔ امام حسین علیہ السلام اس کام سے راضی نہیں۔ مجھے نہیں معلوم اس کام کا آغاز کہاں سے ہوا اور کون سی ذہنیت اسے ہمارے اسلامی اور انقلابی معاشرے میں لا رہی ہے۔

حال ہی میں زیارت کے حوالے سے ایک عجیب و غریب اور نامانوس بدعت ایجاد کی گئی ہے۔ آپ ملاحظہ فرمائیے کہ پیغمبرؐ اور ائمۂ ہدیٰؑ کی قبورِ مطہر کی سب زیارت کرتے ہیں۔ پیغمبرِ اسلامؐ اور امام حسینؑ کے مزارات کی ہمارے ائمہؑ امام جعفر صادقؑ، امام موسیٰ ابنِ جعفرؑ اور بقیہ ائمہؑ زیارت کرتے تھے۔ ایران و عراق میں ائمۂ اہلِ بیتؑ کی قبورِ مطہر کی ہمارے علماء و فقہا زیارت کیا کرتے تھے۔ کیا آپ نے کبھی سنا کہ علماء یا ائمہؑ میں سے کوئی فرد جب زیارت کے لئے آتا ہے تو مزار کے صحن کے دروازے سے سینے کے بل چلتے ہوئے حرم میں داخل ہوتا ہے۔

اگر یہ کوئی مستحسن، مستحب اور اچھا و مقبول عمل ہوتا تو ہمارے بزرگ اسے انجام دیتے۔ لیکن انہوں نے ایسا نہیں کیا۔ حتیٰ منقول ہے کہ عالمِ بزرگ، قوی اور روشن فکر مجتہد آیت اللہ العظمی آقای بروجردی (رضوان اللہ تعالیٰ علیہ) چوکھٹ کا بوسہ لینے سے بھی منع فرماتے تھے، جب کہ شاید یہ ایک مستحب عمل ہو۔ شاید چوکھٹ کو چومنے کے بارے میں روایات میں بھی آیا ہے اور دعاؤں کی کتب میں بھی ہے اور میرے ذہن میں بھی ہے کہ اس بارے میں روایات موجود ہیں۔ گو یہ ایک مستحب عمل ہے اس کے باوجود وہ کہا کرتے تھے کہ یہ کام نہ کیجئے۔ کہیں دوسرے خیال کریں کہ ہم ائمہؑ کی قبورِ مطہر کو سجدہ کرتے ہیں اور

کہیں (اس بنیاد پر) دشمن شیعوں کے خلاف شک و شبہ ایجاد نہ کریں۔

اب بعض لوگ جوں ہی امام علی بن موسیٰ الرضاؑ کے صحنِ مطہر میں داخل ہوتے ہیں اپنے آپ کو گرا لیتے ہیں اور دو سو میٹر کا فاصلہ سینے کے بل طے کرتے ہیں۔ کیا یہ عمل درست ہے؟ نہیں یہ غلط کام ہے، دین اور زیارت کی اہانت ہے۔

کون ان چیزوں کو لوگوں کے درمیان رائج کر رہا ہے؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ یہ دشمن کی کارستانی ہو؟ آپ کو یہ باتیں لوگوں کو بتانا چاہئیں اور ذہنوں کو روشن کرنا چاہئے۔ دین اور اسلام مبنی بر منطق ہے اور اسلام کا منطقی ترین جزء وہ تفسیر ہے جو شیعہ اسلام کے بارے میں رکھتے ہیں۔ شیعہ متکلمین میں سے ہر ایک اپنے زمانے میں خورشیدِ تابناک کی مانند چمکتا تھا۔ کوئی یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ آپ کی منطق کمزور ہے۔ خواہ وہ ائمہؑ کا زمانہ ہو جس میں "مومنِ طاق" اور "ہشام بن حکم" (جیسے اصحابِ ائمہ تھے) اور خواہ ائمہؑ کے بعد نبی نوبخت اور شیخ مفید، جیسے افراد ہوں اور خواہ ان کے بعد کے زمانے میں مرحوم علامہ حلیؒ اور دوسرے لوگ ہوں۔ یہ سب کے سب اہلِ منطق و استدلال تھے۔ ہم اہلِ منطق و استدلال ہیں۔ آپ دیکھئے کہ شیعوں سے مربوط ابحاث میں کتنے قوی استدلال پر مبنی کتب تحریر کی گئی ہیں۔ ہمارے زمانے میں مرحوم شرف الدین کی کتابیں اور علامہ امینی کی الغدیر سرتاپا استدلال اور سیسہ پلائی ہوئی دیوار کی مانند مستحکم ہیں۔

شیعیت یہ ہے، وہ چیزیں نہیں جو نہ صرف استدلال نہیں رکھتیں بلکہ "اشبہ شئی بالخرافہ" (یعنی خرافات سے زیادہ مشابہ) ہیں۔ ایسی چیزیں کیوں ہمارے معاشرے میں داخل کی جا رہی ہیں؟ یہ دین اور معارفِ دینی کے

لئے وہ عظیم خطرہ ہے جس کی جانب عقیدے کی سرحدوں کے محافظوں کو متوجہ رہنا چاہئے۔

میں نے عرض کیا کہ ایک گروہ تک جب یہ باتیں پہنچیں گی تو وہ دل سوزی کے ساتھ کہے گا کہ اچھا ہوتا اگر فلاں ابھی یہ باتیں نہ کرتا۔

نہیں جناب! مجھ پر لازم ہے کہ یہ باتیں کہوں۔ میری ذمہ داری دوسروں سے زیادہ ہے۔ البتہ دوسرے حضرات کو بھی یہ باتیں کہنی چاہئیں۔ آپ کو بھی کہنی چاہئیں۔ امام خمینیؒ جہاں کہیں ایک بھی انحرافی نکتہ دیکھتے تو کمالِ قدرت کے ساتھ اور بے پروا ہو کر اس کے مقابل ڈٹ جاتے۔ اگر یہ چیزیں ان بزرگوار کے زمانے میں بھی ہوتیں یا اس سطح پر رائج ہوتیں تو بے شک وہ بھی یہی باتیں کرتے۔

ایک اور گروہ جسے یہ چیزیں پسند ہیں اسے ان باتوں سے تکلیف پہنچے گی کہ فلاں نے ہماری پسندیدہ ان چیزوں کے بارے میں ایسی باتیں کیوں کیں اور اس لہجہ میں ان کا ذکر کیوں کیا۔ ان لوگوں میں سے بھی اکثر مومنِ صادق اور بے غرض لوگ ہیں لیکن غلط فہمی میں مبتلا ہیں۔

یہ ایک عظیم ذمہ داری ہے جو ہر علاقے اور ہر حصے میں بسنے والے آپ علماء و مبلغین پر عائد ہوتی ہے۔ امام حسینؑ کی مجلسِ عزاء ایسی مجلس ہے جسے معرفت اور ان تین چیزوں کی نمود کا موجب ہونا چاہئے جنہیں میں نے عرض کیا۔

امید ہے کہ خداوندِ متعال آپ کو ان چیزوں کے قدرت، شجاعت، جستجو اور سنجیدگی کے ساتھ بیان میں کامیاب فرمائے جو پروردگارِ عالم کی رضایت کا سبب ہیں۔

والسلام علیکم ورحمۃ اللہ

قیامِ حسینیؑ کی ماہیّت

"آیت اللہ العظمیٰ سید علی خامنہ ای نے ۱۰ر محرم ۱۴۱۶ھ کو تہران یونیورسٹی میں نمازِ جمعہ کے اجتماع میں شریک عزادارانِ امام حسینؑ کے سامنے یہ خطاب ارشاد فرمایا۔"

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ○

الحمدللہ رب العالمین نحمدہ و نستعینہ و نؤمن بہ و نتوکل علیہ و نستغفرہ و نصلی و نسلم علی حبیبہ و نجیبہ و خیرتہ فی خلقہ حافظ سرہ و مبلغ رسالہ بشیر رحمتہ و نذیر نقمتہ سیدنا و نبینا ابی القاسم محمد (ص) و علی آلہ الطیبین الاطھرین المنتجبین المعصومین المطھرین الھداۃ المھدیین سیما بقیہ اللہ فی الارضین و صلی علی ائمہ المسلمین و حماۃ المستضعفین و ھداۃ المومنین عن رسول اللہ (ص) انہ قال : حسین منی و انا من حسین و عنہ علیہ و علی آلہ سلام قال : حسین مصباح الھدی و سفینہ النجاۃ :

تمام نمازی بھائیوں، بہنوں اور خود اپنے آپ کو خوفِ خدا، پرہیزگاری، گناہوں سے اجتناب اور رضائے الٰہی کی طلب کی نصیحت و سفارش کرتا ہوں، کہ

یہی زندگی کی روح اور اس کا مقصد ہے اور یہی چیزیں ہمارے لئے اس دنیا (آخرت) جس میں "لا ینفع مال ولا بنون" (مال اور اولاد فائدہ نہیں پہنچائیں گے) اور اسی طرح اس دنیوی زندگی میں سعادت و سرخروی کا باعث ہیں۔

آج عاشوراء کے دن کی مناسبت سے ہم نے "تحریکِ حسینیؑ" کے بارے میں گفتگو کا ارادہ کیا ہے۔ (خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ) ہماری پوری زندگی امام حسینؑ کی یاد سے لبریز ہے۔ اس عظیم شخصیت کی تحریک کے بارے میں بھی بہت کچھ کہا گیا ہے۔ لیکن عجیب بات ہے کہ اس کے باوجود انسان اس بارے میں جتنا بھی غور و فکر کرے، تحقیق کرے، مطالعے اور تفکر کا میدان اتنا ہی وسیع ہوتا چلا جاتا ہے۔ اب تک بہت سی باتیں اس عظیم اور بے مثال سانحے کے بارے میں موجود ہیں جن کے بارے میں ہمیں سوچنا اور سب کو بتانا چاہئے۔

اس حادثے پر اگر نظر دوڑائیں تو اس روز سے لے کر جب کہ حضرت ابی عبداللہ الحسینؑ مدینہ سے نکلے اور اس روز تک کہ جب وہ مکہ پہنچے، یہاں تک کہ کربلا میں جامِ شہادت نوش فرمایا شاید ہم کہہ سکیں کہ اس چند مہینے کے سفر سے سو سے زیادہ اہم درس حاصل کئے جاسکتے ہیں۔ میں یہ نہیں کہنا چاہتا تھا کہ ہزارہا درس حاصل کئے جاسکتے ہیں۔ گو یہ کہنا بھی بے جا نہ ہوگا۔ ممکن ہے آپؑ کا ہر اشارہ ایک درس ہو۔ لیکن یہ جو میں نے کہا کہ سو سے زیادہ درس تو یہ اس بنا پر ہے کہ اگر ہم ان کاموں کا بغور مشاہدہ کریں تو ان سے سو عنوان حاصل کئے جاسکتے ہیں۔ جن میں سے ہر ایک، ایک ملت کے لئے، ایک تاریخ کے لئے، ایک ملک کے لئے، اپنی تربیت کے لئے، سماج کی رہنمائی کے لئے، خداوندِ عالم کا قرب

حاصل کرنے کے لئے ایک درس ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حسین ابنِ علیؑ (ارواحنا فداہ و فداہ اسمہ و ذکرہ) تمام مقدّسینِ عالم کے درمیان سورج کی سی آب و تاب کے ساتھ چمکے۔ یعنی اگر ہم انبیاءؑ' اولیاء' ائمہؑ' شہداء و صالحین کو چاند اور ستارے شمار کریں تو (ان کے درمیان) آپؑ کی حیثیت سورج کی سی ہے' یہ تمام عظمت اسی بناء پر ہے۔

یہ سو درس اس عمل کے ایک اصلی درس کے ہمراہ ہیں۔ میری کوشش ہے کہ اگر ہو سکے تو آج آپ کے سامنے اس مسئلے کے اسی اصلی درس کی وضاحت کروں۔ وہ تمام حاشیہ ہیں اور یہ (درس) اصل متن ہے۔

وہ اصل درس یہ ہے کہ امام حسینؑ نے کیوں قیام کیا؟

آپؑ مدینے میں محترم ہیں' مکہ میں آپؑ کا اتنا احترام کیا جاتا ہے' یمن میں اتنے شیعہ ہیں' آپؑ کسی گوشے میں چلے جایئے جہاں یزید سے بھی کوئی سروکار نہ رکھیئے' یزید بھی آپؑ سے کوئی سروکار نہ رکھے؟ آپ کے اتنے ارادت مند ہیں' اس قدر شیعہ ہیں' زندگی بسر کیجئے' تبلیغ کیجئے۔ آخر آپؑ نے کیوں قیام کیا؟ مسئلہ کیا ہے؟

یہ ہے وہ اصلی سوال اور اصل درس۔

میں نہیں کہتا کہ ابھی تک کسی نے اس بارے میں کچھ نہیں کہا ہے۔ نہیں بلکہ انصاف کے ساتھ دیکھا جائے تو لوگوں نے (اس موضوع پر) بہت محنت و عرق ریزی سے کام کیا ہے' بہت کوشش کی ہے اور اس بارے میں بہت باتیں کی گئی ہیں۔ اس وقت ہم جو یہاں بیان کر رہے ہیں وہ ہماری نظر میں اس مسئلے کے بارے میں ایک مکمل اور جامع نظریہ اور ایک نیا طرزِ نگاہ ہے۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ امام حسینؑ چاہتے تھے کہ یزید کی فاسد حکومت کو ہٹا کر خود ایک حکومت تشکیل دیں۔

ابا عبداللہؑ کے قیام کا مقصد یہ تھا۔

یہ بات آدھی صحیح ہے۔

میں نہیں کہتا کہ غلط ہے۔

اگر اس بات سے ان کی مراد یہ ہے کہ امامؑ نے تشکیلِ حکومت کے لئے اس طرح قیام کیا کہ جب انہوں نے دیکھا کہ قیام نتیجہ خیز نہیں رہا ہے تو کہا کہ ٹھیک ہے کوئی بات نہیں ہم واپس پلٹ جاتے ہیں۔

جو شخص حکومت کی نیت سے قیام کرتا ہے' وہ صرف اس وقت تک آگے بڑھتا ہے جب تک اسے کامیابی ممکن نظر آ رہی ہو لیکن اگر وہ دیکھے کہ یہ کام ہونے والا نہیں' یا عقلی طور پر ممکن نہیں ہے' تو اس کی ذمہ داری یہ ہے کہ پلٹ جائے۔۔۔۔ اگر اس کی ذمہ داری حکومت کی تشکیل ہے تو قیام کرنا اسی وقت اس کے لئے جائز ہے جب اس کے لئے حکومت کی تشکیل ممکن ہو' لیکن جہاں ممکن نہ ہو وہاں اسے پلٹ جانا چاہئے۔۔۔۔ اگر وہ شخص جو کہتا ہے کہ امام حسینؑ کے قیام کا مقصد حقانیت پر مبنی علوی حکومت کی تشکیل ہے۔ اور اس کی مراد یہ ہے تو نہیں' یہ صحیح نہیں ہے۔ اس لئے کہ مجموعی طور پر (امام حسینؑ کی) اس حرکت میں یہ نظر نہیں آتا (یہ بات ہماری گفتگو سے بعد میں واضح ہو جائے گی۔)

بعض لوگوں نے اس کے بالکل برعکس نکتے کو اٹھایا ہے اور کہا ہے کہ جی نہیں جناب' حکومت کیا چیز ہے؟ امام حسینؑ جانتے تھے کہ حکومت تشکیل نہیں

دے سکتے، بلکہ وہ تو بنیادی طور پر شہید ہونے کے لئے آئے تھے---- یہ بات بھی ایک مدت تک بہت مشہور اور رائج تھی اور بعض زبانیں اسے خوبصورت شاعرانہ تعبیرات کے ساتھ بیان کرتی تھیں۔ بعد میں میں نے دیکھا کہ ہمارے بعض بڑے بڑے علماء نے بھی یہ فرمایا ہے۔ یہ کوئی نئی بات نہیں تھی کہ امامؑ نے شہید ہونے کے لئے قیام کیا کیونکہ وہ دیکھ رہے تھے کہ زندہ رہ جانے میں بھی کوئی فائدہ نہیں ہے۔ لہٰذا چلنا چاہئے اور شہادت کے ذریعے ہی کچھ کرنا چاہئے۔ یہ بات بھی صحیح نہیں ہے۔ ہمیں شرعی اسناد اور اسلامی مدارک میں بھی یہ بات نظر نہیں آتی کہ جاؤ اور خود کو ہلاکت میں ڈال دو۔ ہمارے پاس ایسی کوئی چیز نہیں، ہم شرع مقدس کی رو سے شہادت کے بارے میں جو کچھ جانتے ہیں اور روایات اور قرآنی آیات میں اس بارے میں جو علامات ملتی ہیں وہ یہ ہیں کہ انسان ایک مقدس ہدف (جو یا تو واجب ہو یا راجح) کے حصول کی کوشش کرے اور اس راستے میں مارا جائے تو یہ صحیح اسلامی شہادت ہے---- لیکن یہ کہ انسان بنیادی طور پر مرنے ہی کے لئے نکل کھڑا ہو کہ بقول ایک عالم کے ایک شاعرانہ تعبیر ہے کہ "تاکہ اس طرح میرا خون ظالم کے پیروں کو ڈگمگا دے اور اسے زمین پر گرا دے گا۔"

جی نہیں! وہ چیز جو اس سانحے کی عظمت کا سبب ہے یہ نہیں، ہاں یہ بھی حقیقت کا ایک حصہ ہے لیکن امامؑ کا ہدف نہیں-----

پس خلاصہ یہ کہ ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ امام حسینؑ نے تشکیلِ حکومت کے لئے قیام کیا اور نہ ہی یہ کہہ سکتے ہیں کہ آپؑ کے قیام کا مقصد شہادت تھا۔

ایک اور چیز ہے کہ میں انشاء اللہ کوشش کروں گا کہ اسے پہلے خطبے میں

بیان کر دوں اور اس مسئلہ پر دوسرے خطبے میں زیادہ بات نہ کروں گا۔ شاید انشاء اللہ اسے بیان کر سکیں۔

مجھے یوں نظر آتا ہے کہ وہ لوگ جنہوں نے کہا ہے کہ امامؑ کا مقصد حکومت تھا یا مقصد شہادت تھا ان لوگوں کے ذہنوں میں ہدف اور نتیجہ آپس میں گڈمڈ ہو گئے ہیں۔ (جبکہ) ایسا نہ تھا امام حسینؑ کے سامنے ایک اور مقصد تھا اور اس ہدف کا حصول ایک ایسی حرکت اور ایسے راستے کا محتاج تھا جس کے دو ممکنہ نتائج حکومت یا شہادت تھے۔

البتہ امامؑ دونوں نتائج کے لئے تیار تھے، انہوں نے حکومت کے مقدمات کو بھی آمادہ کیا اور کر رہے تھے اور اسی طرح شہادت کے مقدمات کو بھی آمادہ کیا اور کر رہے تھے۔ اپنے نفس کو اس کے لئے بھی وسعت دے رہے تھے اسُ کے لئے بھی۔ دونوں میں سے جو نتیجہ بھی ملتا صحیح تھا۔ لیکن ان میں سے کوئی بھی "ہدف" نہیں تھا بلکہ دونوں نتیجے تھے۔ ہدف کچھ اور تھا۔

ہدف کیا تھا؟

پہلے میں اس ہدف کو بطورِ خلاصہ ایک جملے میں بیان کرتا ہوں بعد میں کچھ وضاحت کروں گا۔

اگر ہم امام حسینؑ کے ہدف کو بیان کرنا چاہیں تو ہمیں یوں کہنا چاہئے کہ۔

"امامؑ کا ہدف واجباتِ دین میں سے ایک ایسے عظیم واجب کو انجام دینا تھا جسے اس سے پہلے کسی نے بھی انجام نہیں دیا تھا۔"

حتیٰ نہ پیغمبرِ اکرمؐ نے اس واجب کو انجام دیا تھا، نہ امیرالمومنینؑ نے اور نہ

امام حسن مجتبیٰؑ نے۔ یہ ایک ایسا واجب تھا جسے اسلام کے بنیادی، فکری اور عملی نظام میں ایک بہت اہم مقام حاصل ہے۔ باوجود اس کے کہ یہ واجب بہت زیادہ اہم ہے، بہت ہی بنیادی حیثیت رکھتا ہے لیکن امام حسینؑ کے زمانے تک کسی نے اسے انجام نہیں دیا تھا--- کیوں---؟ میں ابھی عرض کرتا ہوں کہ کیوں انجام نہیں دیا گیا تھا۔

امامؑ کو اس واجب پر عمل کرنا تھا تاکہ پوری تاریخ کے لئے ایک درس بن جائے، جیسے پیغمبرِ اکرمؐ نے حکومت تشکیل دی اور تشکیلِ حکومت پوری اسلامی تاریخ کے لئے ایک درس بن گئی، وہ صرف اس کا حکم نہیں لائے۔ یا خدا کے رسولؐ نے جہاد فی سبیل اللہ کیا اور یہ پوری امتِ مسلمہ اور تمام بشریت کی تاریخ کے لئے بھی ہمیشہ کے لئے ایک درس بن کر رہ گیا--- یہ واجب امام حسینؑ کے ذریعے انجام پانا تھا تاکہ تمام مسلمانوں بلکہ پوری تاریخ کے لئے ایک درس بن جائے---

اب سوال یہ پیش آتا ہے کہ آخر امام حسینؑ ہی کیوں اس کام کو انجام دیں---؟ اس لئے کہ اس واجب کو انجام دینے کا موقع ہی ان کے زمانے میں پیش آیا، اگر یہ موقع امام حسینؑ کے زمانے میں پیش آنے کے بجائے مثلاً امام علی النقیؑ کے زمانے میں پیش آتا، تو وہ بھی یہی کام انجام دیتے تو امام علی نقیؑ حادثہ عظیم، ذبح عظیم اور تاریخِ اسلام ہو جاتے۔ اگر امام حسن مجتبیٰؑ کے دور میں پیش آتا تو وہ بزرگوار یہی کرتے۔ اگر امام صادقؑ کے دور میں پیش آتا تو وہ بھی یہی کرتے۔ (یہ موقع) امام حسینؑ سے قبل کے زمانے میں بھی پیش نہ آیا، ان کے بعد بھی پیش نہ آیا، دوسرے ائمہؑ کے دور میں اور دورانِ غیبت میں بھی پیش نہ

آیا، امام حسینؑ کے زمانے میں پیش آیا۔

پس (امام حسینؑ کا) ہدف اس واجب کو انجام دینا تھا جس کی ابھی ہم وضاحت کریں گے۔ اس وقت اس واجب کی ادائیگی دو میں سے کسی ایک نتیجے کا سبب بنتی۔ جو شخص اس واجب کو ادا کرتا وہ یا تو حکومت تک پہنچ جاتا، خوش آمدید، امام حسینؑ حاضر تھے۔ اگر امام حسینؑ قدرت حاصل کرلیتے تو زمامِ کار اپنے ہاتھ میں لے کر پیغمبرِ اسلامؐ اور امیرالمومنینؑ کی مانند معاشرے کا انتظام و انصرام چلاتے--- لیکن اگر حکومت تک نہ پہنچتے اور شہید ہو جاتے، تو آپؑ اس کے لئے بھی تیار تھے۔ خداوندِ عالم نے امام حسینؑ کو اور ائمہؑ کو اس طرح خلق کیا ہے کہ وہ شہادت کے بارِ گراں کو برداشت کرسکیں اور انہوں نے اسے برداشت بھی کیا اور اب مصائبِ کربلا کی داستان ایک اور عظیم باب ہے۔

یہ پوری بات کا خلاصہ تھا، اب میں اس مسئلہ کی تھوڑی وضاحت کرتا ہوں۔

دیکھئے میرے عزیز نماز گزار بھائیو اور بہنو! پیغمبرِ اکرمؐ سمیت ہر پیغمبر احکام کا ایک مجموعہ اپنے ساتھ لے کر آتا ہے۔ ان میں سے بعض احکام انفرادی ہوتے ہیں، اس لئے ہوتے ہیں کہ انسان خود اپنی اصلاح کرے اور بعض احکام اجتماعی ہوتے ہیں تاکہ انسان کی زندگی اور انسان کی دنیا کا انتظام و انصرام کریں، انسانی سماج کو تشکیل دیں۔ احکام کے اس مجموعے کو اسلامی نظام کہتے ہیں۔

اسلام رسولِ اکرمؐ کے مقدس قلب پر نازل ہوا اور نماز، روزہ، زکات، انفاق، حج، گھریلو اور نجی روابط کے احکام لے کر آیا۔ اس کے بعد جہاد فی سبیل اللہ، اسلامی حکومت کی تشکیل، اسلامی اقتصاد، حاکم اور عوام کے روابط اور

حکومت کے مقابلے میں عوام کی ذمہ داریوں کو لے کر آیا۔ اس پورے مجموعے کو اسلام نے بشریت کے لئے پیش کیا اور ان سب کو رسول اللہؐ نے بیان فرمایا "ما من شئی یقربکم الی الجنه و یبعدکم من النار الا وقد عبر تکم به"

وہ تمام چیزیں جو ایک انسان کو، ایک انسانی معاشرے کو فائدہ پہنچاتی ہیں ان سب کو پیغمبرِ اکرمؐ نے بیان کردیا ہے۔ نہ فقط بیان کیا ہے بلکہ ساتھ ساتھ ان سب پر عمل بھی کرکے دکھایا ہے۔ رسولِ اکرمؐ کے زمانے میں اسلامی حکومت تشکیل پائی، اسلامی معاشرہ قائم ہوا، اسلامی اقتصاد کو عملی جامہ پہنایا گیا، اسلامی جہاد انجام دیا گیا، اسلامی زکات لی گئی اور ایک اسلامی مملکت بن گئی، ایک اسلامی نظام وجود میں آگیا۔ اس نظام کو تشکیل دینے والے رسول اللہؐ تھے یا ان کے جانشین۔ اس راستے پر اس قافلے کے رہبر رسول اللہؐ ہیں یا وہ جو ان کی جگہ کو سنبھالیں، راستہ روشن و معین ہے، اسلامی معاشرے اور ہر مسلمان کو اسی راستے پر چلنا چاہئے، اب اگر وہ اسی راستے پر چلتے رہیں تو انسان کمال تک پہنچ جائیں گے، تمام انسان صالح ہوجائیں گے، لوگوں کے درمیان سے ظلم و ستم کا قلع قمع ہوجائے گا، برائیاں ختم ہوجائیں گی، فساد کا خاتمہ ہوگا، اختلافات و انتشار دم توڑدے گا، فقرو فاقہ نابود ہوجائے گا، جہالت ناپید ہوجائے گی اور بشر بدبختی سے نجات پاجائے گا اور اس طرح وہ خدا کا کامل بندہ بن جائے گا۔

اسلام اس نظام کو رسول اللہؐ کے ذریعے لے کر آیا، اسے پہلے مدینہ میں ایک چھوٹے سے معاشرے میں نافذ کیا اور اس کے بعد آہستہ آہستہ اس کو وسعت دی اور مکہ اور دوسرے شہروں میں پھیلا دیا۔

ایک سوال یہاں باقی رہ جاتا ہے اور وہ یہ کہ یہ قافلہ جسے رسول اللہؐ نے ایک راہ پر لگایا ہے، اگر ایک ایسا حادثہ یا واقعہ رونما ہوجائے جو اسے اس کی راہ سے ہٹا دے تو اب کیا فریضہ ہے----؟ اگر اسلامی معاشرہ اپنے راستے سے منحرف ہوجائے اور یہ انحراف اتنا زیادہ ہو کہ پورے اسلام و اسلامی معارف کے انحراف کا خطرہ پیدا ہوجائے (تو کیا کیا جائے) --- کیونکہ انحراف دو قسم کے ہیں۔ ایک مرتبہ لوگ فاسد ہوجاتے ہیں (ایسا بہت ہوتا ہے) لیکن اسلامی احکام میں کوئی انحراف یا تبدیلی واقع نہیں ہوتی اس کے برخلاف ایک مرتبہ یہ ہوتا ہے کہ لوگ تو فاسد ہوتے ہی ہیں ساتھ ساتھ حکومتیں بھی فساد کا شکار ہوجاتی ہیں۔ علماء بھی فاسد ہوجاتے ہیں، دین بتانے والے بھی فاسد ہوجاتے ہیں۔ فاسد افراد سے کبھی بھی صحیح دین صادر نہیں ہوسکتا۔ وہ قرآن میں تحریف کرتے ہیں، حقائق میں تحریف کرتے ہیں، اچھائی کو برائی بنا دیتے ہیں، برائی کو اچھائی بنا دیتے ہیں، منکر کو معروف اور معروف کو منکر کردیتے ہیں، اسلام کی دکھائی ہوئی راہ کو بالکل برعکس سمت میں موڑ دیتے ہیں۔

اگر اسلامی معاشرہ ایسے مقام پر جا پہنچے تو اس وقت کیا ذمہ داری ہے؟ البتہ رسول اللہؐ نے بتا دیا تھا کہ کیا ذمہ داری ہے۔ قرآن نے بھی بیان کردیا ہے کہ ایسے موقع پر کیا فرض عائد ہوتا ہے----؟ "من یر تد منکم عن دینه فسوف یاتی الله بقوم یحبهم و یحبونه" (سورہ مائدہ۵ - آیت۵۴) اور اس کے علاوہ متعدد آیات و روایات اس بارے میں موجود ہیں۔ خود یہ روایت بھی جسے میں امام حسینؑ کی زبانی نقل کررہا ہوں جسے امامؑ نے لوگوں کے سامنے پیش کیا۔

لیکن کیا خود پیغمبرِ اسلامؐ اس حکمِ الٰہی پر عمل کر سکے تھے ----؟ نہیں۔ اس لئے کہ یہ حکمِ الٰہی فقط اسی وقت قابلِ عمل ہے جب معاشرہ منحرف ہو جائے ---- اگر معاشرہ منحرف ہو جائے تو ایک کام کرنا چاہئے' خداوندِ عالم نے اس بارے میں ایک حکم دیا ہے۔ ان معاشروں میں جن میں اس حد تک انحراف واقع ہو جائے کہ پورا اسلام خطرے میں پڑ جائے تو خداوندِ متعال نے سب پر ایک ذمہ داری عائد کی ہے۔ کیونکہ خدا کسی بھی مسئلے میں انسان کو بغیر ذمہ داری کے نہیں چھوڑ سکتا۔ اس تکلیف و ذمہ داری کو رسول اللہؐ نے بیان فرما دیا ہے' قرآن و حدیث نے بھی بتا دیا ہے۔ لیکن پیغمبرؐ اس پر عمل نہیں کر سکے تھے' اس پر اسی وقت عمل ہو سکتا ہے جب معاشرہ مذکورہ حد تک منحرف ہو جائے۔ رسولؐ کے زمانے میں معاشرہ منحرف نہیں ہوا تھا' امیرالمومنینؑ کے زمانے میں بھی معاشرہ اس حد تک منحرف نہیں ہوا تھا' امام حسنؑ کے زمانے میں بھی کہ جب معاویہ تختِ حکومت پر براجمان تھا' اگرچہ انحراف کی بکثرت علامات ظاہر ہو چکی تھیں لیکن وہ اس حد تک نہیں پہنچا تھا کہ پورے اسلام کے ختم ہو جانے کا خوف لاحق ہو جائے۔ ممکن ہے کہا جائے کہ ایک زمانے میں انحراف اس حد تک پہنچ گیا تھا' لیکن اس وقت موقع مناسب نہیں تھا' اس کام کے لئے حالات سازگار نہ تھے۔

یہ حکم جو احکامِ اسلامی کے مجموعے کا ایک جز ہے اس کی اہمیت خود حکومت سے کم نہیں ہے۔ کیونکہ حکومت یعنی معاشرے کا انتظام و انصرام۔ اب اگر یہ معاشرہ تدریجاً اپنے راستے سے ہٹ جاتا ہے' فاسد ہو جاتا ہے' حکمِ خدا تبدیل ہو جاتا ہے اور ہمارے پاس حالات کو تبدیل کرنے اور تجدیدِ حیات کا حکم نہیں

ہوتا۔ یا آج انقلاب کی تعبیر کے مطابق' ہمارے پاس انقلاب کا اور تجدیدِ حیات کا حکم نہ ہو تو یہ حکومت جو اسلام کے نام پر وجود میں آئی تھی اور اب فاسد ہو گئی اور اپنے راستے سے ہٹ گئی ہے کس درد کی دوا ہے؟

پس وہ حکم جو منحرف معاشرے کو اپنے اصلی راستے پر پلٹانے کے لئے آیا ہے اس کی اہمیت کسی طرح بھی خود تشکیلِ حکومت کے حکم سے کم نہیں ہے۔ شاید یہاں تک کہا جا سکے کہ کفار کے ساتھ جہاد کرنے کے حکم سے بھی زیادہ اہم ہے اور شاید یہ بھی کہا جا سکے کہ اس کی اہمیت اسلامی معاشرے کو کئے جانے والے ایک عام امر بالمعروف و نہی عن المنکر سے بھی زیادہ ہے' حد یہ ہے کہ شاید ہم یہ بھی کہہ سکیں کہ یہ عمل خدا کی بڑی بڑی عبادتوں اور حج سے بھی زیادہ اہمیت کا حامل ہے۔

کیوں ----؟ اس لئے کہ یہ حکم درحقیقت اس حال میں اسلام کی حیات کی ضمانت ہے جب وہ اگلے ہی لمحہ مرنے والا ہو' یا مر کر نابود ہو چکا ہو ----

اچھا' اب سوال یہ پیش آتا ہے کہ اس حکم کی بجا آوری کس پر لازم ہے؟ اس فریضے کی ادائیگی کس پر ضروری ہے؟ پیغمبرؐ کے اس جانشین پر جو اس زمانہ میں موجود ہو جب یہ انحراف وجود میں آیا ہے۔ لیکن اس شرط کے ساتھ کہ اسے سازگار مواقع حاصل ہوں۔ کیونکہ خداوندِ عالم اپنے بندوں پر کسی ایسی ذمہ داری کو عائد نہیں کرتا جس کا کوئی فائدہ نہ ہو۔ اگر مناسب موقع نہ ہو تو جو کام بھی کیا جائے بے سود ہو گا' غیر موثر ہو گا۔ لازم ہے کہ مناسب موقع ہو۔ البتہ مناسب موقع ہونے کے ایک دوسرے معنی بھی ہیں۔ اس کے معنی یہ نہیں کہ کیونکہ خطرہ ہے اس لئے مناسب موقع نہیں ---- نہیں' یہاں یہ مراد نہیں۔ مناسب موقع

ہونے کے معنی یہ ہیں کہ انسان کو معلوم ہو کہ جو کام وہ انجام دے رہا ہے اس کا نتیجہ بر آمد ہوگا، یعنی لوگوں تک اس کا پیغام پہنچے گا، لوگ جان لیں گے، غلط فہمی کا شکار نہ رہیں گے۔ یہ وہ ذمہ داری ہے جس کی انجام دہی ایک فرد پر ضروری ہے۔

اب جب کہ امام حسینؑ کے زمانے میں وہ انحراف بھی وجود میں آگیا ہے اور موقع بھی پیدا ہوگیا ہے۔ پس حسینؑ کے لئے ضروری ہے کہ وہ قیام کریں۔

انحراف پیدا ہو چکا ہے۔ یعنی معاویہ کے بعد ایک ایسا شخص برسرِ حکومت آیا ہے جو حد تو یہ ہے کہ اسلام کی ظاہری باتوں کی پابندی کو بھی ملحوظ نہیں رکھتا۔ شراب پیتا ہے، حرام کاموں کا مرتکب ہوتا ہے، کھلم کھلا انحراف کا شکار ہے، قرآن کی مخالفت میں بولتا ہے، قرآن اور دین کے خلاف شعر کہتا ہے، علانیہ اسلام کی مخالفت کرتا ہے۔ چونکہ مسلمانوں کا سربراہ ہے اس لئے اسلام سے نسبت کو ختم نہیں کرسکتا، وگرنہ اسلام پر عمل پیرا نہیں، اسلام سے لگاؤ نہیں رکھتا، اسلام کے بارے میں دلسوزی نہیں رکھتا۔ بلکہ اس کا عمل اس گندے پانی کے چشمہ کی مانند ہے جس سے رسنے والا پانی پورے تالاب کو گندہ کررہا ہو۔ اس کے وجود سے خارج ہونے والا گندہ پانی پورے اسلامی معاشرے کو گندگی سے بھر دے گا---فاسد حاکم اسی طرح ہوتا ہے۔

حاکم پہاڑ کی چوٹی کی مانند ہے لہٰذا جو کچھ اس سے صادر ہوگا وہ وہیں نہیں رہے گا بلکہ پورے پہاڑ پر پھیل جائے گا۔ عام آدمی کا معاملہ اس کے برخلاف ہے وہ جو کچھ بھی ہوتا ہے اپنے ہی میں رہتا ہے۔ البتہ جو جتنا بلند مرتبہ رکھتا ہے اور معاشرے میں جس قدر اعلیٰ مقام پر فائز ہوتا ہے اسی قدر اس کے فساد کا

نقصان زیادہ ہوتا ہے۔ عام آدمیوں کا فساد میں مبتلا ہونا خود ان کے لئے ضرر رساں ہوتا ہے۔ ممکن ہے ان کے نزدیکی ایک دو افراد کے فساد میں مبتلا ہونے کا موجب ہو۔ لیکن ایسا شخص جو سربراہی کے منصب پر فائز ہو اور فاسد ہو تو اس کا فساد بڑھتا ہے اور پوری فضا کو آلودہ کردیتا ہے۔ اسی طرح اگر وہ صالح ہو تو اس کی صالحیت پھیلتی ہے اور پورے ماحول کو لبریز کردیتی ہے۔

معاویہ کے بعد ایک ایسا فاسد شخص خلیفۂ مسلمین ہوا ہے----

پھر اس انحراف سے بڑھ کر یہ کہ (قیام کے لئے) زمین بھی ہموار ہے۔

زمین ہموار ہے یعنی کیا مطلب----؟ یعنی کیا خطرہ موجود نہیں؟

کیوں نہیں خطرہ تو ہے۔ کیا ممکن ہے کہ جو اس قدر طاقت و قدرت کا مالک ہو وہ اپنے مخالفوں کے لئے خطرات پیدا نہ کرے۔ خوب، پتہ چلا کہ جنگ کا امکان ہے، آپؑ چاہتے ہیں کہ اسے تختِ حکومت سے نیچے گھسیٹ لیں۔ تو کیا وہ بیٹھا آپ کا تماشہ دیکھا کرے گا۔ ظاہر ہے وہ بھی آپ پر ضرب لگائے گا۔ پس معلوم ہوا کہ خطرہ ہے۔

یہ جو ہم نے کہا کہ موقع مناسب ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اسلامی معاشرے کی فضا ایسی ہے کہ امام حسینؑ کا پیغام اسی زمانے یا طولِ تاریخ میں بکھرے ہوئے انسانوں تک پہنچ جائے گا۔

اگر امام حسینؑ معاویہ کے دور میں قیام کرنا چاہتے تو آپؑ کا پیغام دفن ہوجاتا۔ یہ اس بناء پر ہے کہ معاویہ کے دور میں حکومت کی نوعیت کچھ اسی قسم کی تھی۔ میں اس وقت اس بات کی وضاحت نہیں کرنا چاہتا۔ ایسی سیاست تھی کہ لوگ سچائی کو سننے کی سکت نہ رکھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ امام حسینؑ معاویہ

کے دورِ اقتدار میں دس سال امام رہے لیکن کچھ نہ کہا۔ کوئی اقدام نہ کیا۔ کوئی قیام نہ کیا۔ کیونکہ اس زمانے کے حالات سازگار نہ تھے۔ ان سے پہلے امام حسنؑ تھے لیکن انہوں نے بھی قیام نہ کیا۔ کیونکہ حالات سازگار نہ تھے۔ ایسا نہ تھا کہ امام حسنؑ (نعوذ باللہ) اس کام کے اہل نہ تھے۔ حسنؑ اور حسینؑ میں کوئی فرق نہیں۔ امام حسینؑ اور امام سجادؑ میں کوئی فرق نہیں، امام حسینؑ، امام علی نقی اور امام حسن عسکری علیہم السلام میں کوئی فرق نہیں ہے۔

البتہ اب جب کہ امام حسینؑ نے یہ مجاہدت کی تو ان کا مقام ان سے بلند ہے جنہوں نے یہ کام نہیں کیا۔ لیکن مقامِ امامت کے اعتبار سے سب یکساں ہیں، جس امامؑ کو بھی یہ حالات پیش آتے وہ یہی کرتا اور اسی مقام پر پہنچتا۔

پس امام حسینؑ اس انحراف کے زمانے میں تھے تو ان پر لازم ہے کہ یہ فریضہ انجام دیں۔ جب کہ حالات بھی سازگار ہیں۔ پس اب کوئی عذر موجود نہیں۔ لہٰذا جب عبداللہ بن جعفر، محمد بن حنفیہ، عبداللہ بن عباس، یہ لوگ جو عام افرادِ معاشرہ نہ تھے، یہ سب دین شناس تھے، عارف، عالم، بافہم افراد تھے، یہ جب امامؑ سے کہتے ہیں کہ خطرہ ہے، نہ جائیے۔ یہ کہنا چاہتے تھے کہ جب ذمہ داری کی ادائیگی کی راہ میں خطرہ ہو تو ذمہ داری ختم ہو جاتی ہے۔ وہ نہیں جانتے تھے کہ یہ ذمہ داری وہ ذمہ داری نہیں جو خطرے کی وجہ سے ختم ہو جاتی ہے۔ خطرہ ہو تو ہو، اس ذمہ داری کی ادائیگی ہمیشہ پُرخطر ہے۔

کب ممکن ہے کہ انسان حسبِ ظاہر اس قدر طاقتور قوت کے مقابل قیام کرے اور اسے خطرہ نہ ہو۔ کیا ایسا ہو سکتا ہے۔۔۔؟ یہ ذمہ داری ہمیشہ پُرخطر ہے۔ امام خمینیؒ سے بھی لوگوں نے کہا تھا کہ جناب آپ شاہ کے مقابلے پر ہیں، یہ

خطرناک بات ہے۔ کیا امام کو معلوم نہ تھا کہ خطرہ ہے۔۔۔؟ امام واقف نہ تھے کہ شاہ کی پولیس لوگوں کو گرفتار کر لیتی ہے، مار ڈالتی ہے، اذیتیں دیتی ہے، اس کے دوستوں کو مار ڈالتی ہے، جلاوطن کر دیتی ہے، کیا یہ باتیں امام نہ جانتے تھے؟

کیوں نہیں، اچھی طرح جانتے تھے۔ جو کام امام حسینؑ کے زمانے میں انجام دیا گیا، اس کا ایک چھوٹا سا نمونہ امام خمینیؒ کے زمانے میں انجام پایا۔ وہاں اس کا نتیجہ شہادت کی صورت میں ظاہر ہوا، یہاں حکومتِ اسلامی کی صورت میں۔ یہ وہی بات ہے اس میں کوئی فرق نہیں۔ امام حسینؑ کا ہدف اور امام خمینیؒ کا ہدف ایک ہی تھا۔ (حاضرین کے نعرے)

ہم چاہتے ہیں کہ آپ اس بحث کو خوب اچھی طرح سنیں اور ان مفاہیم کو ذہن نشین رکھیں۔ ہم نہیں چاہتے کہ یونہی وقت گزاری کی جائے۔ مذکورہ مفاہیم معارفِ حسینیؑ کی اساس ہیں اور معارفِ حسینیؑ معارفِ شیعہ کا ایک عظیم حصہ ہیں۔ یہ بحث تمام ابحاث کی ستون ہے اور یہ خود اسلام کا ایک ستون ہے۔ البتہ اگر کسی وقت آپ نعرہ لگانا چاہتے ہیں تو میں اس کا مخالف نہیں لیکن میری خواہش یہ ہے کہ آپ غور سے سنیں تاکہ مفاہیم بے ربط نہ ہو جائیں۔ پس (امام حسینؑ کا) ہدف عبارت ہوا اسلام کو اس کی صحیح راہ پر پلٹانا، اسلامی معاشرے کو راہِ راست پر لگانا۔ کب۔۔۔؟ جب راہ تبدیل ہو گئی ہو اور کسی کی جہالت، ظلم، استبداد اور خیانت نے مسلمانوں کو منحرف کر دیا ہو۔ (یہ ایک بات ہے)

(پھر) میدان بھی ہموار ہے۔ شرائط بھی آمادہ ہیں۔ البتہ دورانِ تاریخ میں مختلف اوقات پائے جاتے ہیں۔ کبھی حالات سازگار ہوتے ہیں اور کبھی سازگار نہیں ہوتے۔ امام حسینؑ کے زمانے میں حالات سازگار تھے، ہمارے زمانے میں

بھی آمادہ تھے۔ امام خمینیؒ نے وہی کام کیا۔ جیسا کہ ہم نے عرض کیا۔ ہدف و مقصد ایک ہی تھا۔ جب انسان اس مقصد کی جستجو میں بڑھتا ہے اور حکومت اور باطل کے مرکز کے خلاف قیام کرنا چاہتا ہے۔ اس مقصد کے لئے (جہاد کرنا چاہتا ہے) کہ اسلام، سماج اور اسلامی نظام کو اپنے صحیح مرکز پر پلٹائے، تو کبھی وہ اپنے قیام کے نتیجے میں حکومت تک پہنچ جاتا ہے۔ یہ اس کی ایک صورت ہے۔ بحمد اللہ ہمارے زمانے میں ایسا ہی ہوا اور اسلامی حکومت قائم ہوگئی۔ لیکن کبھی کسی موقع پر اس قیام کا نتیجہ حکومتِ اسلامی کے قیام کی صورت میں نہیں نکلتا بلکہ شہادت کی صورت میں سامنے آتا ہے۔ کیا اس صورت میں (قیام) واجب نہیں۔۔۔؟ کیوں نہیں۔۔۔ اگر نتیجہ شہادت کی صورت میں بھی نکلے تب بھی واجب ہے۔

کیا نتیجہ شہادت کی صورت میں ظاہر ہونے پر قیام کا کوئی فائدہ نہیں؟

کیوں نہیں، (تشکیلِ حکومت یا شہادت ہر دو صورتوں میں) کوئی فرق نہیں پڑتا۔

یہ قیام یہ تحریک ہر دو صورتوں میں فائدہ مند ہے۔ خواہ نتیجہ شہادت نکلے یا حکومت۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ دونوں نتائج ایک طرح سے (علیحدہ علیحدہ) مفید ہیں۔ (لہٰذا لازم ہے کہ فریضہ) انجام دیا جائے، حرکت کی جائے اور یہ وہ کام تھا جسے امام حسینؑ نے انجام دیا۔

ہم کہہ سکتے ہیں کہ امام حسینؑ نے اولین بار اس حرکت کو انجام دیا، ان سے قبل اسے انجام نہ دیا گیا تھا۔ کیوں۔۔۔؟ اس لئے کہ ان سے قبل یہ حالات پیدا نہ ہوئے تھے۔ پیغمبرِ اسلامؐ اور امیرالمومنینؑ کے دور میں یہ انحراف

وجود میں نہ آیا تھا اور اگر ایسا موقع اور انحراف وجود میں آیا بھی تھا تو (قیام کے لئے) حالات سازگار نہ تھے۔ امام حسینؑ کے زمانے میں دونوں چیزیں موجود تھیں۔ یہ امام حسینؑ کی تحریک کے باب میں بنیادی مسئلہ ہے۔

پس ہم (اپنی گفتگو کا) اس طرح سے خلاصہ کرسکتے ہیں کہ امام حسین علیہ السلام نے قیام کیا تاکہ اس عظیم واجب کو ادا کریں جو اسلامی نظام اور اسلامی سماج کی تعمیرِ نو، یا اسلامی معاشرے میں اٹھنے والے عظیم انحراف کے خلاف قیام سے عبارت ہے۔

یہ (جدوجہد) قیام کے طریقوں میں سے ہے، امر بالمعروف کے طریقوں میں سے ہے بلکہ خود امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا ایک بڑا مصداق ہے۔ البتہ یہ کام، جیسا کہ میں نے عرض کیا کبھی اس کا نتیجہ حکومت کی صورت میں برآمد ہوتا ہے۔ امام حسینؑ اس کے لئے آمادہ تھے اور کبھی نتیجہ شہادت کی صورت میں (نکلتا ہے) امام حسینؑ اس کے لئے بھی تیار تھے۔ میں اس مطلب کو جس دلیل کی بنیاد پر پیش کررہا ہوں، اسے ہم خود امام حسینؑ کے کلمات سے اخذ کرتے ہیں۔ میں نے یہاں امام حسینؑ کے کلمات میں سے چند ایک کو منتخب کیا ہے، البتہ اس سے کہیں زیادہ کلمات موجود ہیں جو سب کے سب یہی معنی بیان کرتے ہیں۔

سب سے پہلے مدینہ میں اس رات جب حاکمِ مدینہ ولید ابن عتبہ نے آپؑ کو طلب کیا اور کہا کہ معاویہ دنیا سے کوچ کرچکا ہے اور اب آپؑ کو بیعت کرنا ہے۔ حضرتؑ نے اس سے فرمایا

"ننظرو و تنظرون اینا احق بالخلافه"

"صبح تک دیکھتے ہیں۔ جاتے ہیں، سوچتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ ہمیں

خلیفہ ہونا چاہئے یا یزید کو۔"

اگلے روز سرِ راہ مروان سے آپؑ کی ملاقات ہوئی تو اس نے آپؑ کو مخاطب کر کے کہا۔

"اے حسینؑ! آپؑ کیوں خود کو موت کے منہ میں دیتے ہیں، کیوں خلیفہ کی بیعت نہیں کر لیتے، اپنے قتل کا سامان نہ کریں، خود کو مشکل میں مت ڈالیں۔"

امام حسینؑ نے اس کے جواب میں یہ فقرہ ارشاد فرمایا۔

"انا للّٰہ و انا الیہ راجعون وعلی الاسلام السلام اذقد بلیت الامہ براع مثل یزید"

"اگر مسلمانوں پر یزید جیسا حاکم حکمراں ہو تو اسلام پر سلام بھیجنا چاہئے، اس کا خدا ہی حافظ ہو۔"

مسئلہ یزید کی ذات کا نہ تھا بلکہ حضرت کہنا چاہتے تھے کہ اب تک جو بھی تھا وہ قابلِ برداشت تھا۔ لیکن اب معاملہ اسلام کی بنیادوں کا ہے، اسلامی نظام اور اصولِ دین درمیان میں ہیں اور یہ یزید جیسے کی حکومت کے نتیجے میں نابود ہو جائیں گے۔

آپؑ اشارہ فرما رہے تھے کہ انحراف کا یہ خطرہ انتہائی سنگین ہے، مسئلہ اسلام کی بنیادوں کے خطرے میں مبتلا ہو جانے کا ہے۔

مکہ سے نکلتے ہوئے اس وصیت میں، البتہ امام حسینؑ نے مدینہ سے نکلتے وقت اور مکہ سے بھی نکلتے وقت محمد بن حنفیہ سے گفتگو کی تھی، میرے خیال میں یہ وصیت اس وقت کی گئی جب آپؑ نے ماہ ذی الحجہ میں مکہ سے نکلنا چاہا اور محمد بن حنفیہ بھی وہاں آئے ہوئے تھے اور وہاں بھی انہوں نے حضرتؑ سے گفتگو کی۔ یہ

اسی وقت کی بات ہے کہ حضرتؑ نے بعنوانِ وصیت محمد بن حنفیہ کو کچھ باتیں لکھ کر دیں۔ اس وصیت میں خدا کی وحدانیت پر گواہی اور دوسری باتوں کے بیان کے بعد اس مقام پر پہنچے کہ۔

"وانی لم اخرج اشرا ولا بطرا ولا ظالما ولا مفسدا"

یعنی کوئی اس غلط فہمی میں نہ رہے اور پروپیگنڈہ کرنے والے یہ پروپیگنڈہ نہ کریں کہ حسینؑ نے بھی ان لوگوں کی مانند خروج کیا جو یہاں وہاں طاقت و قدرت ہاتھ میں لئے خود نمائی کرنے، عیش و عشرت کے لئے، ظلم کے لئے اور فساد پھیلانے کے لئے جنگ و جدال کے میدان میں داخل ہوتے ہیں۔ ہمارا معاملہ ایسا نہیں۔

"بل خرجت لاصلاح فی امۃ جدی"

"میرا مقصد اصلاح ہے، میں چاہتا ہوں کہ امتِ جد کی اصلاح کروں۔"

یہ وہی واجب ہے جو امام حسینؑ سے پہلے انجام نہیں دیا گیا۔

"خرجت لاصلاح فی امۃ جدی" اور اس اصلاح کا طریقہ خروج ہے، خروج یعنی قیام۔

امامؑ نے اپنے وصیت نامہ میں جس بات کا ذکر کیا وہ اسی مفہوم کی وضاحت ہے۔ یعنی اول تو ہم خروج یعنی قیام کرنا چاہتے ہیں اور ہمارا یہ قیام اصلاح کے لئے ہے، ہر حال میں حکومت کے حصول کے لئے نہیں۔ اور نہ ہی اس لئے ہے کہ لازماً شہید ہو جائیں۔ نہیں ہم اصلاح کرنا چاہتے ہیں۔

البتہ اصلاح کوئی معمولی کام نہیں۔ ایک وقت حالات ایسے ہوتے ہیں کہ انسان حکومت تک پہنچ جاتا ہے اور زمامِ اقتدار کو اپنے ہاتھ میں لے لیتا ہے۔

اور ایک وقت اصلاح کا عمل انجام نہیں دے پاتا اور شہید ہو جاتا ہے۔ بہرحال ہر دو صورتوں میں (ہمارا) قیام اصلاح کے لئے ہے۔

اس کے بعد فرماتے ہیں کہ۔

"اریدان امر بالمعروف و انهی عن المنکر و اسیر بسیرة جدی"

اس طریقے سے اصلاح انجام دیں گے جیسا کہ ہم نے عرض کیا کہ یہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر کی مصداق ہے اور یہ بھی ایک علیحدہ بیان ہے۔

مکہ سے حضرتؑ نے دو خطوط لکھے ایک بصرہ کی سرکردہ شخصیات کے نام اور دوسرا کوفہ کی سربر آوردہ شخصیات کے لئے۔ عمائدینِ بصرہ کے نام امامؑ کے خط میں تحریر تھا کہ۔

"و قدبعثت رسولی الیکم بهذا الکتاب و انا ادعوکم الی کتاب اللّٰه و سنته نبیه فان السنة قد امینت و البدعة قد احییت فان تسمعوا قولی اهدیکم الی سبیل الرشاد"

"میں بدعت کا خاتمہ اور سنت کا احیاء چاہتا ہوں کیونکہ انہوں نے سنت کو مار دیا ہے اور بدعت کو زندہ کر دیا ہے۔ اگر میرے ساتھ آؤ گے تو راہِ راست میرے ہی پاس ہے۔"

یعنی میں اس عظیم ذمہ داری کو ادا کرنا چاہتا ہوں جو احیاء اسلام، احیاء سنتِ پیغمبرؐ اور اسلامی نظام کو حیاتِ تازہ عطا کرنا ہے۔

یہ تو تھا اہلِ بصرہ کے نام تحریر کیا ہوا خط۔ اس کے بعد آپؑ نے اہلِ کوفہ کے

نام خط میں تحریر فرمایا۔

"فلعمری ما الامام الا العامل بالکتاب والاخذ بالقسط والدائن بدین الحق والحابس نفسه علی ذات اللّٰه : والسلام"

ایسا شخص امام و پیشوا اور اسلامی معاشرے کا سربراہ نہیں ہو سکتا جو فاسق، فاجر، خائن، مفسد اور خدا سے دور ہو، بلکہ ایسا ہونا چاہئے جو کتابِ خدا پر عمل کرتا ہو، یعنی معاشرے میں اس پر عمل پیرا ہو نہ یہ کہ خود تنہا کمرے میں بند ہو کر نماز پڑھتا ہو۔ (بلکہ) معاشرے میں کتابِ خدا پر عمل کا احیاء کرے، عدل و انصاف سے کام لے، حق کو معاشرے کا قانون قرار دے، یعنی دین و آئین، سماج و قانون اور معاشرتی ضوابط کو حق کی بنیاد پر قائم کرے اور باطل کو برطرف کرے۔

"والحابس نفسه علی ذات اللّٰه"

"ظاہراً اس جملے کے معنی یہ ہیں کہ ہر حال میں صراطِ مستقیم پر قائم رہے اور مادی و شیطانی میلانات کا اسیر نہ ہو۔"

اور آخر میں اہلِ کوفہ کو سلام تحریر کیا۔

یعنی امامؑ ہدف کا تعین کرتے ہیں۔

مکہ سے نکلنے کے بعد درمیانِ راہ میں مختلف منزلوں پر، ہر مقام پر اپنے طرح طرح کے سامعین کے سامنے مختلف لب و لہجے میں امامؑ یہی بات پیش کرتے ہیں۔

اس حال میں جب کہ "حر بن یزید ریاحی" اور امام حسینؑ کے لشکر ساتھ

ساتھ چل رہے تھے۔ منزلِ "بیضا" پر پہنچ کر ان دونوں لشکروں نے قیام کیا۔ شاید کچھ دیر ستانے کے بعد یا اس سے پہلے ہی امامؑ دشمن کے لشکر کے سامنے خطاب کی نیت سے کھڑے ہوئے اور یوں فرمایا۔

"ایھا الناس ان رسول اللہؐ (ص) قال من رای سلطانا جائرا مستحلا کحرم اللہ ناکثا لعھد اللہ مخالفا لسنۃ اللہ یعمل فی عباداللہ بالاثم والعدوان فلم یغیر علیہ بقول او فعل کان حقا علی اللہ ان یدخلہ مدخلہ"

"یعنی اگر کوئی دیکھے کہ معاشرے پر ایک ایسا حاکم برسرِکار ہے جو ظلم کرتا ہے، حرامِ خدا کو حلال شمار کرتا ہو اور حلالِ خدا کو حرام، حکمِ خدا کو نظرانداز کرتا ہے، ان پر عمل نہیں کرتا اور دوسروں کو ان پر عمل پر نہیں ابھارتا۔ لوگوں کے ساتھ گناہ، دشمنی اور ظلم کا برتاؤ کرتا ہے۔ یعنی فاسد، ظالم اور جائر حاکم کہ یزید جس کا کامل مصداق ہے۔ اگر کوئی اسلامی معاشرے میں میری امت کے درمیان ایسی چیز کو دیکھے۔"

پیغمبرؐ نے فرمایا۔

"ولم یغیر علیہ بقول ولا فعل"

"اور زبان اور عمل سے اس کے خلاف اقدام نہ کرے۔"

"کان حقا علی اللہ ان یدخلہ مدخلہ"

"تو خداوندِ عالم اس لاتعلق اور بے عمل خاموش کو بھی روزِ قیامت اسی انجام سے دوچار کرے گا جو اس ظالم کا مقدر ہوگا، وہ اس کے ساتھ ایک ہی

صف، ایک ہی گروہ میں شامل ہوگا۔"

یہ بات پیغمبرؐ نے فرمائی ہے۔

یہ جو ہم نے عرض کیا کہ پیغمبرؐ نے اس بات کا زبانی حکم دیا تھا تو یہ مذکورہ بات اس کا ایک نمونہ ہے۔ پس پیغمبرؐ نے واضح کردیا تھا کہ اسلامی نظام کے راہِ راست سے ہٹ جانے کی صورت میں کیا کرنا چاہئے۔ امام حسینؑ نے پیغمبرؐ کے اسی ارشاد کو اپنی بات کی سند کے طور پر پیش کیا۔

پس (امام حسینؑ کی) ذمہ داری کیا ہوئی؟

ذمہ داری ہوئی کہ "یغیر علیہ بقول و فعل"

لہٰذا اگر ایسے حالات پیدا ہوجائیں البتہ شرط یہ ہے کہ سازگار موقع بھی میسر ہو تو جیسا کہ ہم نے کہا انسان کو چاہئے کہ اس (حکمران) کے خلاف قیام کرے، خواہ اس کا کوئی بھی نتیجہ برآمد ہو، مارا جائے، زندہ رہے، حسبِ ظاہر کامیاب ہو کہ نہ ہو۔۔۔۔ ایسے حالات میں ہر ایک مسلمان کو چاہئے کہ وہ قیام و اقدام کرے۔ یہ وہ فریضہ ہے جس کے متعلق پیغمبرؐ نے فرمایا ہے۔

اس کے بعد فرمایا۔ "وانا احق من غیری" میں اس اقدام کو اٹھانے کے لئے تمام مسلمانوں میں لائق تر و مناسب تر ہوں۔ کیونکہ میں فرزندِ پیغمبرؐ ہوں۔ اگر پیغمبرِ اسلامؐ نے ہر مسلمان پر یہ ذمہ داری واجب قرار دی ہے تو میں حسین ابنِ علیؑ فرزندِ پیغمبرؐ پیغمبرؐ کے علم و حکمت کے وارث پر واجب تر ہے کہ وہ اقدام کرے۔۔۔

پس (امامؑ) اپنے قیام کی وجہ کا جو دراصل تغیر و انقلاب ہے اعلان فرما رہے ہیں۔ یعنی (میرا) قیام و اقدام ان حالات کے مقابلے کے لئے ہے۔

یہ ایک بات تھی۔

"غدیر" نامی ایک منزل پر چار افراد امامؑ کے ساتھ شامل ہوئے۔ حضرت نے فرمایا

"اما واللہ انی لا رجوان یکون خیر ما اراد اللہ بناء قتلنا ام ظفرنا"

یہ بھی اسی بات کی عکاسی ہے جسے ہم نے بیان کیا کہ "فرق نہیں پڑتا' کامیابی تک پہنچیں یا مارے جائیں۔" ذمہ داری' ذمہ داری ہے اسے بہرحال انجام پانا چاہئے۔ فرمایا کہ "مجھے امید ہے کہ خداوندِ عالم نے ہمارے لئے جس چیز کو نظر میں رکھا ہے اسی میں ہمارے لئے بہتری ہے۔ خواہ ہم مارے جائیں خواہ کامیابی ہمارے قدم چومے فرق نہیں پڑتا۔ یعنی ہمارا فریضہ اپنی ذمہ داری کی ادائیگی ہے۔

سرزمینِ کربلا آمد کے بعد اپنے پہلے ہی خطبے میں فرمایا۔

"فقد نزل بنا من الامر ما قد ترون" جسے تفصیل سے ارشاد فرمایا اور آخر میں فرمایا۔

"الا ترون الی الحق لا یعمل بہ والی الباطل لا یتناھی عنہ لیرغب المومن فی لقاء ربہ محقا۔۔۔"

پس امام حسینؑ نے ایک واجب کی ادائیگی کے لئے قیام کیا اور یہ واجب ہر دور کے ایک ایک مسلمان کے ذمہ ہے اور یہ واجب اس بات سے عبارت ہے کہ جب بھی اسلامی معاشرے کا نظام ایک بنیادی فساد سے دوچار نظر آئے اور

اسلامی احکام کے مکمل طور پر تبدیل ہوجانے کا خوف محسوس ہو' تو ہر مسلمان کو چاہئے کہ قیام کرے۔ البتہ مناسب اور سازگار ماحول کی موجودگی میں۔ اس وقت جب اسے معلوم ہو کہ یہ قیام موثر رہے گا۔ زندہ بچے رہنا شرائط میں شامل نہیں ہے۔ مارے نہ جانا شامل نہیں' اذیت و آزار سے دوچار نہ ہونا شامل نہیں' مذکورہ چیزیں شرائط کا حصہ نہیں۔ لہٰذا امام حسینؑ نے قیام کیا اور عملی طور پر اس واجب کو ادا کیا تاکہ رہتی دنیا تک سب انسانوں کے لئے سبق آموز رہے۔

ممکن ہے طولِ تاریخ میں جس کسی کو یہ مناسب حالات میسر ہوں وہ اس عمل کو انجام دے۔ البتہ امام حسینؑ کے بعد کسی اور امامؑ کے زمانے میں ایسے حالات پیش نہ آئے۔

خود یہ بات تجزیہ طلب ہے کہ کیونکر ایسے حالات پیش نہ آئے۔ کیونکہ دوسرے انتہائی اہم امور تھے جنہیں انجام دینا ضروری تھا اور اسلامی معاشرے میں حضورؐ کے آخری زمانے اور غیبتِ امامؑ کے ابتدائی دور تک پھر کبھی حالات نے یہ رخ اختیار نہ کیا۔ لیکن دورانِ تاریخ میں اسلامی ممالک میں متعدد مواقع پر ایسے حالات پیش آئے۔ اس وقت بھی شاید دنیائے اسلام میں ایسے مقامات ہیں جہاں میدان میسّر ہے اور مسلمانوں کو چاہئے کہ اپنا فریضہ انجام دیں۔ اگر انہوں نے اس فریضے کو انجام دیا تو گویا انہوں نے اپنی ذمہ داری ادا کی اور اسلام کے رواج اور اس کی حیات کی ضمانت کا موجب ہوئے۔ انہیں ایک دو مرتبہ شکست کا سامنا بھی ہوسکتا ہے لیکن جب یہ اصلاحی تحریک مسلسل جاری رہے گی تو یقیناً فساد و انحراف کی جڑیں کٹ جائیں گی اور وہ سرے سے ختم

ہو جائے گا۔

اس وقت (امام حسینؑ کے زمانے میں) کوئی اس عمل سے واقف نہ تھا۔ کیونکہ یہ عمل زمانۂ پیغمبرؐ میں بھی انجام نہ دیا گیا تھا، خلیفۂ اول کے دور میں بھی انجام نہ دیا گیا تھا، امیرالمومنینؑ بھی گو کہ معصوم تھے، انہوں نے بھی اسے انجام نہ دیا تھا۔ لہٰذا اس طرح امام حسینؑ نے عملی طور پر پوری تاریخِ اسلام کو ایک درس دیا اور درحقیقت اسلام کا بیمہ کردیا۔ خود اپنے زمانے میں بھی اسلام کی ضمانت فراہم کرگئے اور ہر دوسرے زمانے میں بھی، جس جگہ بھی ایسا فساد پایا جائے وہاں امام حسینؑ زندہ ہیں۔ وہ اپنے شیوہ و عمل سے کہہ رہے ہیں کہ تم کیا کررہے ہو؟ تمہارا فریضہ یہ ہے ---- لہٰذا یادِ حسینؑ اور کربلا کی یاد کو زندہ رہنا چاہئے۔ کیونکہ کربلا کی یاد اس عملی درس کو نظروں کے سامنے لے آتی ہے۔

افسوس کہ دوسرے اسلامی ممالک میں عاشوراء کے درس کو جس طرح پہچانا جانا چاہئے اس طرح پہچانا نہیں گیا۔ اسے پہچانا جانا چاہئے ---- ہمارے ملک میں پہچانا گیا ہے۔ ہمارے ملک میں لوگ امام حسینؑ کو پہچانتے ہیں۔ امام حسینؑ کے قیام کو جانتے ہیں۔ حسینیؑ روح پائی جاتی تھی۔ لہٰذا، جب امام خمینیؒ نے فرمایا کہ محرم وہ مہینہ ہے جس میں خون نے تلوار پر فتح پائی، تو لوگ متعجب نہ ہوئے۔ حقیقت یہی ہے کہ لہو، تلوار پر فتحیاب ہوا۔

ہم نے کئی برس پہلے اپنے جلسوں میں سے کسی ایک میں اجتماع کے سامنے اس مطلب کو بیان کیا تھا۔ البتہ انقلاب سے پہلے کی بات ہے۔ میرے ذہن میں ایک مثال آئی، اسے میں نے اس جلسے میں بیان کیا۔ شاید اس وقت اس بات کو

۲۴، ۲۵ سال ہوچکے ہیں۔ یہ مثال ایک طوطے کی ہے۔

مولوی اپنی مثنوی میں ذکر کرتا ہے کہ ایک شخص کے گھر میں ایک طوطا تھا، وہ شخص ہندوستان کے سفر کو گیا (البتہ یہ ایک مثال ہے اور یہ مثالیں حقائق کو بیان کرنے کے واسطے ہوتی ہیں) جب وہ شخص ہندوستان کے سفر پر روانہ ہونے لگا تو اس نے اپنے اہل و عیال کو خدا حافظ کہنے کے ساتھ ساتھ اس طوطے کو بھی الوداع کہا۔ اس نے طوطے سے کہا کہ میں ہندوستان جارہا ہوں، ہندوستان تمہارا وطن ہے (طوطوں کو ہندوستان سے لے کر آیا جاتا ہے) کیا تمہیں اپنے ساتھیوں سے کوئی بات کہنی ہے، طوطے نے کہا جی ہاں! تم فلاں علاقہ میں جانا وہاں میرے اعزہ و اقربا اور دوست ملیں گے، تم ان سے کہنا کہ تمہارا ایک ساتھی میرے گھر میں رہتا ہے اور ان سے میرا حال بیان کرنا اور انہیں بتانا کہ وہ میرے گھر میں پنجرے میں بند ہے، بس صرف یہی پیغام پہنچادینا میں تم سے اور کچھ نہیں چاہتا۔

وہ شخص ہندوستان پہنچا اس مخصوص علاقے میں جس کی طوطے نے نشاندہی کی تھی گیا، وہاں دیکھا کہ بہت سے طوطے درخت پر بیٹھے ہیں۔ اس نے ان کی طرف رخ کیا اور کہا کہ اے اچھے اور میٹھی بولی بولنے والے طوطو میرے پاس تمہارے لئے ایک پیغام ہے۔ تمہارا ایک ساتھی میرے گھر میں ہے، وہ بہت اچھے حالوں میں ہے، پنجرے میں مزے کی زندگی گزار رہا ہے، بہترین اور مناسب غذائیں کھاتا ہے، اس نے تمہیں سلام بھیجا ہے۔

تاجر نے دیکھا کہ اس کے یہ الفاظ سن کر یکلخت درختوں پر صحیح سلامت بیٹھے ہوئے تمام طوطے پھڑپھڑاتے ہوئے زمین پر گرنے لگے۔ اس نے آگے بڑھ

کر دیکھا تو سب مر چکے تھے۔ اسے بہت افسوس ہوا، سوچنے لگا میں نے کیوں یہ بات کی کہ یہ تمام حیوان خود اپنی جان سے گزر گئے۔ وہ بہت متاسف ہوا۔ لیکن اب کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ واپس اپنے گھر پہنچ کر طوطے کے پاس گیا اور اس سے کہا کہ میں نے تیرا پیغام پہنچایا تھا۔ طوطے نے پوچھا انہوں نے کیا جواب دیا۔ تاجر نے کہا کہ میں نے جب تمہارا پیغام انہیں دیا تو وہ تمام کے تمام اپنے پر پھڑپھڑاتے ہوئے زمین پر گرے اور مر گئے۔ تاجر نے اپنی بات ختم کی ہی تھی کہ دیکھا وہ طوطا بھی پھڑپھڑاتا ہوا پنجرے کے فرش پر گرا اور مر گیا۔

تاجر کو بہت افسوس ہوا اس نے پنجرے کا دروازہ کھولا کیونکہ طوطا مر چکا تھا اور اب اسے پالا نہیں جا سکتا تھا۔ اس نے طوطے کا پیر پکڑا اور اٹھا کر چھت پر پھینک دیا، پھینکنے کے بعد تاجر نے دیکھا تو کیا دیکھتا ہے کہ طوطا پر پھڑپھڑا کر اڑتا ہوا دیوار پر جا بیٹھا اور کہا کہ اے تاجر دوست میں تمہارا بہت ممنون ہوں، تم نے خود میری آزادی کا وسیلہ فراہم کیا۔ میں مرا نہیں تھا بلکہ خود کو مردہ ظاہر کیا تھا اور یہ وہ سبق تھا جو ان (ہندوستان کے) طوطوں نے مجھے سکھایا تھا۔ جب انہیں معلوم ہوا کہ میں یہاں پنجرے میں قید ہوں، تو انہوں نے سوچا کہ کس زبان سے مجھے نجات کا راستہ بتائیں، تو انہوں نے عملی طور پر مجھے نجات کی راہ دکھائی اور مجھے بتایا کہ یہ عمل انجام دوں تو نجات پا جاؤں گا۔ یعنی مر جاؤ تاکہ زندہ ہو سکو۔ اور میں نے ان کا پیغام تیرے ذریعہ حاصل کیا اور یہ وہ عملی درس تھا جو مکانی فاصلے کے باوجود وہاں سے میرے پاس پہنچا اور میں نے اس سے استفادہ کیا۔

ہم نے بیس اور کچھ سال قبل ان برادران و خواہران سے جو یہ سن رہے تھے کہا تھا کہ عزیزو ! امام حسینؑ کس زباں سے کہیں کہ آپ کی ذمہ داری کیا

ہے؟

حالات ویسے ہی حالات ہیں، زندگی ویسی ہی زندگی ہے، اسلام بھی وہی اسلام ہے۔ امام حسینؑ نے تمام آئندہ نسلوں کو عملاً بتادیا۔ اگر امام حسینؑ کی زبان سے جاری ہونے والا ایک حرف بھی نقل نہیں ہوتا تب بھی ہمیں اپنے فریضہ کو جان لینا چاہئے تھا۔ ایسی قوم جو قید و بند کا شکار ہے، جسے اپنے سربراہوں کے فساد کا سامنا ہے۔ ایسی قوم جس پر دشمنانِ دین کی حکومت ہے اور جنہوں نے ان کی زندگیوں کو اپنے ہاتھ میں لے رکھا ہے۔ ہر زمانے کے ایسے لوگوں کو جان لینا چاہئے کہ ان کی ذمہ داری کیا ہے۔ جس طرح فرزندِ پیغمبرؐ، امامِ معصومؑ نے بتایا کہ ایسے حالات میں کیا کرنا چاہئے۔ یہ زبان سے کہنے سے نہیں ہو سکتا تھا۔ اگر سو زبانوں سے بھی اس بات کو بیان فرماتے لیکن خود عملاً کر کے نہ دکھاتے تو ممکن نہ تھا کہ یہ پیغام آئندہ نسلوں تک پہنچتا۔ تاریخ کو محض نصیحت کرنے اور زبان سے کہنے سے عبور نہیں کیا جا سکتا۔ ہزار طرح سے بیان کریں لیکن عمل ساتھ ہونا چاہئے اور وہ بھی ایسا عظیم عمل، ایسا سخت عمل، ایسی باعظمت فداکاری جس کا مظاہرہ امام حسینؑ نے کیا اور عاشوراء کے دن جو نظارہ ہماری آنکھوں کے سامنے آتا ہے اس کے متعلق یہ کہنا بجا ہے کہ وہ تمام حوادث جو ہمیں تاریخِ انسانی میں نظر آتے ہیں ان سب کے مقابل حادثۂ کربلا اب بھی یکتا و بے نظیر ہے۔ جیسا کہ پیغمبرِ اسلامؐ نے فرمایا، امیرالمومنینؑ نے فرمایا، امام حسنؑ نے فرمایا وہ بات جو روایات میں ہے کہ کوئی دن تمہارے جیسا، تیرے عاشوراء جیسا، تیری کربلا جیسا، تیرے حادثے جیسا نہیں۔

آج بھی روزِ عاشوراء ہے۔ میرا دل چاہتا ہے کہ مصائب کے چند جملے عرض

کروں۔ کربلا مکمل طور پر مصائب سے معمور ہے۔ عاشوراء کا ہر حادثہ گریہ آور اور دردناک ہے۔ جس حصہ کو بھی آپ ملاحظہ فرمائیں۔ جب سے امامؑ کربلا میں داخل ہوئے، امام حسینؑ کی گفتگو، ان کے الفاظ، ان کے خطبات، ان کا شعر پڑھنا، ان کا موت کی خبر دہرانا، بہن سے گفتگو کرنا، بھائیوں سے عزیزوں سے باتیں کرنا یہ سب چیزیں مصیبت ہیں۔ یہاں تک کہ شبِ عاشور اور روزِ عاشوراء اور ظہر و عصرِ عاشوراء---- ان میں سے ایک گوشے کا میں ذکر کرتا ہوں۔ یہ ایام ایامِ گریہ وبکا ہیں اور ہم بھی جس جگہ بھی سنتے ہیں۔ میں بھی اس عظیم حسینی دعوت میں مختصراً شریک ہونے کے لئے یہ چند کلمات عرض کررہا ہے۔ میرا خیال ہے کہ یہ ملت جس نے راہِ خدا میں ہزاروں جوان فدا کئے ہیں۔ شاید اس اجتماع میں ہزاروں افراد ایسے ہوں جن کے جوان فدا ہوئے ہوں۔ سوچتا ہوں امام حسینؑ کے جوانوں کے بارے میں چند کلمات عرض کروں۔

ہم سب سے کہتے ہیں کہ مصائب کے متن کو پڑھیں۔ بندہ چاہتا ہے کہ ابنِ طاوؤس کی کتاب لھوف کا متن آپ کے گوش گزار کرے تاکہ آپ دیکھیں کہ متن میں مذکور مصائب کیسے ہوتے ہیں۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ کتاب میں درج چیز کو بیان کرنا ممکن نہیں۔ بلکہ اسے بنانا سنوارنا چاہئے۔ ہاں، بسااوقات اس میں بھی کوئی حرج نہیں۔ لیکن ہم اس کتاب سے چند کلمات پڑھتے ہیں۔ یہ ابنِ طاوؤس کی کتاب لھوف ہے۔ یہ چھٹی صدی کے نامور شیعہ علماء میں سے ہیں، علماء کے گھرانے سے ہیں۔ دیندار گھرانے سے ہیں اور یہ سب نہایت اعلیٰ پائے کے لوگ تھے۔ خاص طور پر یہ دو بھائی یعنی علی بن موسیٰ بن جعفر بن طاوؤس اور احمد بن موسیٰ بن جعفر بن

طاوؤس۔ یہ دونوں بھائی بزرگ علماء و مولفین میں سے ہیں۔ یہ کتاب سید علی بن موسیٰ بن جعفر بن طاوؤس کی ہے۔ ہمارے ذاکرین کے بقول اس کتاب کی عبارات، روایات کی مانند پڑھی جاتی ہیں۔ میں اس کتاب سے پڑھتا ہوں۔

کہتے ہیں جب تمام اصحابِ امام حسینؑ شہید ہوگئے اور ان کے افرادِ خانہ کے سوا کوئی باقی نہ بچا تو علی اکبرؑ خیمہ گاہ سے باہر تشریف لائے۔ علی اکبرؑ خوبصورت ترین جوانوں میں سے تھے۔ آپؑ اپنے والدِ گرامی کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کی کہ بابا جان اجازت دیجئے کہ جنگ کے لئے جاؤں اور اپنی جان آپؑ پر قربان کروں۔ امامؑ نے بغیر کسی پس و پیش کے انہیں اجازت دے دی۔ یہ (علی اکبرؑ) امامؑ کے اصحاب، بھتیجوں، بھانجوں میں سے نہ تھے جو امام ان سے کہتے کہ نہ جاؤ۔ یہ خود ان کے جسم کا ٹکڑا ہے۔ ان کا پارۂ جگر ہے۔ جب وہ جانا چاہتا ہے تو حسینؑ کو چاہئے کہ اسے جانے کی اجازت دیں۔ یہ امام حسینؑ کا انفاق ہے۔ یہ امام حسینؑ کا اسماعیل ہے جو میدان کی جانب گامزن ہے۔ امامؑ نے انہیں جانے کی اجازت دی۔

جب علی اکبرؑ میدان کی طرف جانے لگے تو امامؑ نے ایک حسرت بھری نگاہ ان کے سراپے پر ڈال کر فرمایا خدایا! تو گواہ رہنا ایسے جوان کو جنگ اور موت کے منہ کی طرف بھیج رہا ہوں جو ہر لحاظ سے پیغمبرؐ کی شبیہ تھا۔ چہرے مہرے سے بھی، گفتگو کے انداز سے بھی، اخلاق میں بھی، ہر ہر پہلو سے۔ کیسا جوان تھا----؟ جس کا اخلاق سب سے زیادہ پیغمبرؐ سے مشابہ تھا، جس کا قیافہ بھی سب سے زیادہ پیغمبرؐ سے مشابہ تھا، اس کا گفتگو کرنا بھی سب سے زیادہ پیغمبرؐ سے مشابہ تھا۔

آپ سوچئے کہ امامؑ ایسے جوان سے کس قدر محبت کرتے ہوں گے؟ اس

جوان سے صرف اسی لئے عشق نہیں کرتے کہ یہ ان کا فرزند ہے بلکہ اس لئے کہ یہ شبیہ پیغمبرؐ ہے۔ وہ حسینؑ جو پیغمبرؐ کی گود میں بڑے ہوئے تھے، اس بیٹے سے بہت محبت کرتے تھے اور ان کے لئے اس بیٹے کا میدان میں جانا بہت گراں ہے۔ بالآخر علی اکبرؑ گئے۔ مرحوم ابنِ طاوؤس نقل کرتے ہیں کہ یہ جواں میدانِ جنگ میں آیا اور خوب جنگ کی۔ اس کے بعد اپنے والد کے پاس آئے اور فرمایا، بابا جان پیاس نے مجھے نڈھال کردیا ہے۔ اگر آپ کے پاس تھوڑا سا پانی ہو تو مجھے دے دیجئے۔ حضرتؑ نے انہیں جواب دیا اور وہ دوبارہ میدان کی سمت واپس پلٹ گئے۔ حضرتؑ نے جواب میں فرمایا کہ جاؤ میدانِ جنگ کی طرف جاؤ کچھ ہی دیر بعد اپنے جد کے ہاتھ سے سیراب ہوجاؤ گے۔ علی اکبرؑ میدانِ جنگ میں پلٹ کر آئے۔ عظیم الشان جنگ کی، انتہائی شجاعت کے ساتھ لڑے، ناگہاں اشقیاء میں سے ایک نے انہیں اپنے نیزے کے نشانے پر لیا۔ جس کے نتیجے میں یہ گھوڑے سے زمین پر گر پڑے اور جوان کی صدا بلند ہوئی کہ بابا جان خدا حافظ، یہ میرے جد پیغمبرؐ آپؑ کو سلام کہتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ میرے فرزند حسینؑ جلد آجاؤ، میرے پاس آیئے اس کے بعد علی اکبرؑ نے ایک آہ کھینچی اور ان کی روح بدن سے پرواز کرگئی۔

امام حسینؑ نے جوں ہی اپنے فرزند کی صدا سنی میدانِ جنگ کی طرف لپکے جہاں ان کا جوان زمین پر پڑا ہوا تھا۔ امامؑ جوان کے سرہانے تشریف لائے اور اپنا چہرۂ مبارک علی اکبرؑ کے چہرے پر رکھ دیا اور یہ کلمات بیان فرمائے۔ راوی کہتا ہے، ایسا شخص جس نے اس واقعہ کو نزدیک سے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے نقل کرتا ہے، کہتا ہے کہ ایک وقت میں نے دیکھا کہ حضرت زینبؑ خیمہ سے باہر

آئیں۔ ان کی صدا بلند ہوئی اے عزیزِ من، اے میرے برادر زادے، آگے بڑھیں اور خود کو حضرت علی اکبرؑ کے بے جان پیکر پر گرا لیا۔

حضرتؑ آگے بڑھے، اپنی بہن کو بازو سے پکڑا، انہیں علی اکبرؑ کے جسدِ اطہر سے اٹھایا اور عورتوں میں بھیج دیا۔ مناسب نہ تھا کہ وہ (زینبؑ) میدانِ جنگ میں رہیں۔

اگر ان کلمات کو پڑھا جائے تو سننے والوں کا دل پانی پانی ہو جائے۔

ایک بات میرے ذہن میں آتی ہے۔ جب حضرت زینبؑ آئیں۔ یہ جملہ ابنِ طاوؤس کا ہے، اور روایات میں سے ہے جو لازماً صحیح اخبار کے ذریعہ نقل کی گئی ہے۔ امام حسینؑ کے متعلق نہیں کہا کہ انہوں نے اپنے آپ کو علی اکبرؑ کے اوپر گرا لیا، امام حسینؑ نے صرف اپنا چہرہ جوان کے چہرے پر رکھا۔ مگر وہ جس نے خود کو علی اکبرؑ پر گرایا وہ زینبِ کبریٰ تھیں۔ مجھے خیال آتا ہے کہ یہ زینبِ بزرگوار، یہ سادات کی پھوپھی، جس کے اپنے دو جوان فرزند بھی کربلا میں شہید ہوئے تھے، اس کے اپنے دو علی اکبر شہید ہوئے تھے---- میں نے کسی کتاب میں نہیں دیکھا کہ جب زینبؑ کے بچے شہید ہوئے تو انہوں نے کسی ردِ عمل کا اظہار کیا، مثلاً نہ ہی انہوں نے کوئی آہ و فغاں کی، نہ ہی گریہ و نالہ بلند کیا اور نہ ہی خود کو ان کے اجسادِ مطہرہ پر گرایا، یہ ہمارے زمانے کے شہداء کی مائیں زینب کی بتائی ہوئی راہ ہی پر عمل پیرا ہیں۔ میں نے بہت کم دیکھا ہے کہ ایک، دو اور تین تین شہیدوں کی مائیں عجز و ضعف کا شکار ہوئی ہوں۔ یہ مائیں یقیناً شیرنیاں ہیں۔ انسان دیکھتا ہے کہ یہ زینبِ کبریٰ ان ماؤں کا اصل نمونہ ہیں۔ ان کے دو جوان بیٹے عون و محمد شہید ہوئے، انہوں نے کوئی ردِّ عمل ظاہر نہ کیا۔ لیکن اپنے

بیٹوں کے علاوہ دو جگہ پر انہوں نے خود کو شہداء کے لاشوں پر گرایا۔ ایک یہی جگہ ہے جہاں وہ علی اکبرؑ کے سرہانے آئیں اور بے اختیار خود کو علی اکبرؑ کے جسم پر گرایا، ایک عصرِ عاشوراء ہے جب انہوں نے خود کو اپنے بھائی حسینؑ کے جسدِ اطہر پر گرایا۔ ان کی صدا بلند ہوئی اور کہا اے رسول اللہ" اے پیغمبرِ خداؐ" یہ آپؐ کا حسین ہے، یہ آپؐ کا عزیز اور پارۂ تن ہے---- کس قدر مصائب برداشت کئے۔

دوسرا خطبہ شروع کرنے سے قبل بارگاہِ خدا میں دستِ دعا دراز کرتا ہوں، ان اشک بار آنکھوں سے خدا کو پکارتے ہیں، جمعہ کا روز اور وقتِ ظہر ہے انشاء اللہ خدا ہم پر اپنی برکات و نعمات نازل فرمائے گا۔

"پروردگارا! تجھے حسینؑ و زینبؑ کی قسم ہمیں ان کے چاہنے والوں اور پیروکاروں میں قرار دے۔

پروردگارا! ہماری زندگی کو حسینیؑ زندگی قرار دے۔

پروردگارا! ہماری موت کو حسینیؑ موت قرار دے۔

پروردگارا! ہمارے عزیز امام کو جنہوں نے ہماری اس راہ کی طرف ہدایت کی، شہدائے کربلا کے ساتھ محشور فرما۔

پروردگارا! ہمارے عزیز شہداء کو شہداء کربلا کے ساتھ محشور فرما۔

پروردگارا! وہ لوگ جنہوں نے خدا کی راہ میں، اس انقلاب کی راہ میں، اسلام کی راہ میں اپنی جانوں کی بازی لگائی ہے، ہمارے عزیز جانباز، ایثار گر، آزاد شدہ اسرا اور وہ لوگ جو ابھی تک دشمنوں کی قید میں ہیں

انہیں اپنے فضل و رحمت کے خزانے سے مالا مال کردے۔

پروردگارا! اس امت و ملت پر اپنی رحمت نازل فرما۔

پروردگارا! اس ملت کی تمام مشکلات کو اپنی رحمت، تدبیر اور حکمت سے برطرف فرما۔

پروردگارا! اس عظیم ملت، ملتِ حسینیؑ و عاشورائی کو تمام چھوٹے بڑے دشمنوں پر فاتح قرار دے۔

پروردگارا! اس کے دشمنوں کو مایوس و ناکام فرما۔

پروردگارا! اسلام کو ہمارے درمیان روز بروز زندہ و شاداب تر فرما۔

پروردگارا! وہ لوگ جو ہماری اس ملت کے لئے، ملک کے لئے، اس امت کے لئے زحمتیں اٹھا رہے ہیں، ہر لحاظ سے خدمت کر رہے ہیں، مخصوصاً حکومت کے وہ عہدیدار جو دل سے خدمت کر رہے ہیں ان کا بہترین اجر انہیں عطا فرما۔

پروردگارا! ہماری اموات کی بخشش فرما۔

پروردگارا! ہمارے مریضوں کو شفاء عطا فرما۔

پروردگارا! ہمارے ماں باپ اور اساتید کو اپنے فضل و رحمت میں شامل فرما۔

پروردگارا! وہ تمام افراد جو کسی قسم کی کوئی حاجت رکھتے ہیں، جنہوں نے ہم سے دعا کی التماس کی ہے کہ ان کے مسائل تیری درگاہ میں لے کر آئیں اے پروردگار! ان کی حاجات کو دور فرمادے۔

پروردگارا! بحقِ محمد و آلِ محمدؐ دنیا کے گوشہ و کنار میں پھیلی ہوئی امتِ

مسلمہ کو سربلند فرما، انہیں حسینیؑ فریضے کی تعلیم فرما اور انہیں اس کے انجام دینے کی توفیق عطا فرما۔

پروردگارا! تجھے محمدؐ و آلِ محمدؐ کی قسم قلبِ مبارکِ امامِ زمانؑ کو ہم سے راضی و خوشنود فرمادے۔

پروردگارا! تجھے محمدؐ و آلِ محمدؐ کا صدقہ ہمیں ان کے ساتھیوں میں سے قرار دے، ہمیں ان بزرگوار کی زیارت کی توفیق عطا فرما۔

پروردگارا! تجھے محمدؐ و آلِ محمدؐ کا صدقہ ہمیں ہر خیر عنایت فرما اور ہر شر سے اپنے حفظ و امان میں رکھ۔

والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

ہماری مطبوعات

درسِ قرآن
مکتبِ تشیع اور قرآن
اسرارِ نہج البلاغہ
نہج البلاغہ سے چند منتخب نصیحتیں
مذہبِ اہلِ بیتؑ
شیعیت کا آغاز کب اور کیسے
فلسفۂ امامت
اہلِ بیتؑ، آیتِ تطہیر کی روشنی میں
ائمہ سیریز (مکمل سیٹ)
سوانح حیات حضرت فاطمۃ الزہراؑ
اہلِ بیتؑ کی زندگی مقاصد کی ہم آہنگی، زمانہ کی نیرنگی
فدک تاریخ کی روشنی میں
آمریت کے خلاف ائمۂ طاہرینؑ کی جدوجہد
صدائے حضرتِ سجادؑ
سوانح حیات حضرت امام حسینؑ
تفسیرِ سیاسی قیامِ امام حسینؑ
ائمۂ معصومینؑ کی سیاسی زندگی کا تحقیقی جائزہ
اثباتِ وجودِ خدا
۲۰ جواب
آسان عقائد (دو جلدیں)
تعلیمِ دین سادہ زبان میں (دو جلدیں)
حسینؑ شناسی
انقلابِ حسینؑ پر محققانہ نظر
فکرِ حسینؑ کی الف، ب

تفسیرِ عاشورا
عزاداری کیوں؟
عاشورا اور خواتین
پیامِ شہیداں
ہمارا پیام
آزمائش
درسِ انقلاب
اسلامی تحریک قرآن و سنت کی روشنی میں
شناختِ استکبار
عوامی حکومت یا ولایتِ فقیہ
کتاب المومن
خاندان کا اخلاق
ازدواج در اسلام
اسلام میں خواتین کے حقوق
آسان مسائل
عورت پردے کی آغوش میں
اسلامی اتحاد، مسلکِ اہلِ بیتؑ کی روشنی میں
مادیت و کمیونزم
خاک پر سجدہ مقصد، اہمیت، حقیقت
عظیم لوگوں کی کامیابی کے راز
انسان کے کمال میں اخلاق کا کردار
دعائے افتتاح
دعائے ندبہ
زیارتِ جامعہ